۷۸۶

مثنوی گلزارِ نسیم

المعروف بہ

قصۂ گلِ بکاؤلی

مع تنقید و تبصرہ و تشریحات

مرتبہ

ظہیر احمد صدیقی ایم اے (علیگ)
شعبۂ اردو
دلّی کالج۔ دہلی

پبلشرز: ایجوکیشنل بُک ہاؤس
سول لائن حامد علی بلڈنگ یونیورسٹی ایریا علی گڑھ (یو۔پی)

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

فہرست

اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ کے نام
جس نے مجھے ادبی قدروں سے روشناس کرایا

یاں دیپک علم و عرفاں کا گوشے گوشے میں روشن ہے
یہ خطہ خطۂ یوناں ہے۔ یہ وادی وادیٔ ایمن ہے

احقر
ظہیر

دیباچہ

بوئے از کاکلِ دلدار در آید بہ مشام
ہر سحر گہہ کہ ز گلزار نسیمے آید

کل کی بات ہے کہ معرکۂ شرر و چکبست نے ادبی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ہوا خواہان شرر نے نسیم کی مثنوی پر الزام لگایا کہ یہ مثنوی آتش نے اپنے شاگرد نسیم کو لکھ کر دیدی تھی چکبست کے بھی خواہ بھلا یہ الزام کیونکر برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اس کا جواب دیا اور سخت دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے وہ طعن و طنز کی کیچڑ اچھالی گئی کہ توبہ ہی بھلی شرر کا ادعا گو غلط تھا۔ مگر انہوں نے ضبط اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑا۔ مگر چکبست کے ساتھیوں نے گو بات درست کہی تھی۔ مگر بری طرح۔ یہ ہنگامہ ایک عرصہ تک قائم رہا اور اس کا نتیجہ ہے کہ آج گو یہ دعوی کرنے والا کوئی نہیں ہے کہ گلزار نسیم آتش کی جدت طبع کا نتیجہ ہے مگر ان دونوں کا موازنہ عموماً اہل قلم میں موضوع بحث ہوتا ہے۔

مجھے مثنویوں میں صرف تین مثنویاں پسند ہیں سحر البیان گلزار نسیم

اور زہرعشق ۔ اور یہ تینوں مثنویاں ہمارے ادب میں ایک نمایاں درجہ پر فائز ہیں۔ سحرالبیان کو مرتب کرنے کے بعد میں اپنی یہ دوسری کتاب مثنوی کے سلسلہ میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ ایڈیشن طلبار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی ۔ البتہ یہ کوشش ضرور کی ہے کہ طلبار کی سہولت کے سامان بہم پہونچانے میں کوتاہی باقی نہ رہ جائے۔

مقدمہ میں کوشش یہ کی ہے کہ طلبار کا نظریہ وسیع اور مطالعہ عمیق ہو سکے ۔ اس کے علاوہ حواشی بھی پیش کر دیئے ہیں کہ طلبہ کے لئے معاون ثابت ہو سکیں۔ علاوہ بریں مثنوی میں ایسے اشعار حذف کر دئے ہیں جو مخرب اخلاق تھے ۔

احقر

ظہیر احمد صدیقی

علی گڈھ

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

مقدمہ

گمان برم کہ مگر بوئے زلف جاناں است
سحر گہے کہ نسیمے ز بوستاں بہ جہد

مثنوی کی اہمیت

جب اُردو شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہمارے سامنے غزل آجاتی ہے۔ اصنافِ شاعری میں غزل کو جو اہمیت حاصل ہے وہ مشکل سے کسی اور صنف کو میسّر ہے۔ غزل کی آفاقیت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے اکثر مشہور شاعر وہی گذرے ہیں جنہوں نے غزلیں کہی ہیں۔ اور آسمانِ شاعری پر آفتاب بن کر چمکے ہیں۔ مگر اس کے برخلاف جب کوئی مبتدی طبع آزمائی کرتا ہے تو اپنا نشانہ سب سے پہلے غزل ہی کو بناتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ غزل انتہائی مشکل ہونے کے ساتھ بظاہر آسان بھی ہے۔ غزل کے بعد مثنوی کا نام ذہن میں آتا ہے جو جامعیت کے اعتبار سے غزل سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اس میں غزل کی رعنائیاں بھی ہیں اور قصیدہ کا شان و شکوہ بھی۔ رندانِ بلانوش کی ہاؤ ہو کے نعرے بھی ہیں اور صوفیوں کی اللہ ہو کی آوازیں بھی۔ حسن و عشق کی داستانیں بھی مل جائیں گی اور رزم گاہ میں تلواروں کی جھنکار کی آوازیں بھی صاف سنائی دیں گی۔ غرض کون سا دلکش نقش ہے جو اس نگارِ زیبا کو نہ بخشا گیا ہو اور کون سی ادا ہے جو اس شاہدِ جمیل کے حصّہ میں نہ آئی ہو۔ خود زندگی ہنستی بولتی۔ گاتی مسکراتی سسکتی اور کراہتی اپنے پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ مثنوی میں اس طرح نظر آئیگی۔

جیسے یہ سب ہماری تصویریں ہیں جو کسی آئینہ خانہ میں سجائی گئی ہیں علامہ شبلی
جن کی رائے اُردو ادب میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے مثنوی کی
تعریف میں لکھتے ہیں۔

"انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع[1] کی بہ نسبت زیادہ
مفید۔ زیادہ وسیع۔ زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع
ہیں سب اس میں نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔ جذبات
انسانی۔ مناظر قدرت۔ واقعہ نگاری اور تخیل ان تمام چیزوں
کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا ......
اس آسانی اور وسعت کی وجہ یہ ہے کہ مثنوی کا ہر شعر علیحدہ ہوتا ہے
اس لئے یہ پابندی نہیں ہوتی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں ادا کی
جائے جیسا کہ غزل اور قصیدہ میں یہ لازمی ہے۔ مثنوی کے لئے
اشعار کی تعداد بھی محدود نہیں۔ اس لئے جس قدر وسعت دینا چاہیں
دے سکتے ہیں۔ مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ رزمیہ، عشقیہ، تصوف
فلسفہ۔ واقعہ نگاری جو مضمون چاہیں مثنوی میں ادا کر سکتے ہیں"۔

ناول کے متعلق آرنلڈ بینیٹ (ARNOLD BONNET) کا عقیدہ ہے
کہ اس میں تین چیزوں کا ہونا لازمی ہے۔ (۱) دائرہ عمل (۲) تنقید حیات
(۳) افراد کے ساتھ ناول نگار کا برتاؤ۔ ادب کی ہر صنف نے اپنے کچھ
حدود متعین کر لئے ہیں۔ ہر صنف ادب کا میدان جداگانہ ہوتا ہے جس طرح

---

[1] شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۲۳۰ از شبلی

ناول یا ڈرامے دونوں کا مقصد زندگی کے تماشے کو پیش کرنا ہوتا ہے اسی طرح مثنوی بھی انسانی زندگی کے اعمال و کردار پر کماحقہ روشنی ڈالتی ہے۔ جس میں واقعات کا تسلسل اور ارادوں کی کشمکش اپنے محرکات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ ڈرامہ میں صرف زندگی کو پیش کر دیا جاتا ہے مگر مثنوی اس پر خاموش تبصرہ بھی کرتی ہے۔ مثنوی میں صرف کرداروں کی زندگی اور کشمکش نہیں ہوتی بلکہ اس میں شاعر کی شخصیت کو دخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ صرف واقعات کو پیش کر دے اور اپنی شخصیت کو دخل نہ دے غلط ہے۔ ایسی صورت میں مثنوی کا دائرہ محدود ہو جائیگا مثنوی اس دور کی رزمیہ بھی ہے اور بزمیہ بھی جس میں عمل ہوتا ہے اول یہ عمل کی دلچسپی ہم کو کرداروں کے حرکات و سکنات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ کردار ایک کہانی کو وجود میں لاتے ہیں۔ مگر اس سے بھی دلچسپ تر چیز ہوتی ہے ان کا زاویہ نظر جو مختلف مسائل کو ترتیب دیتا ہے۔ مثنوی کے ذریعہ زندگی کو کرداروں کی شکل میں اسٹیج پر لاتے ہیں۔ کلیم الدین جیسا سخت نقاد لکھتا ہے۔

"غزل[1] اور قصیدہ کے مقابلہ میں مثنوی میں زیادہ وسعت اور تنوع کی گنجائش ہے۔ مثنوی میں رزمیہ شاعری ہو سکتی ہے اور نئے نئے افسانوں کی ایجاد بھی ہو سکتی ہے دنیا کے گوناگوں بدلنے والے مناظر کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی جا سکتی ہیں۔ اور زندگی کے مختلف پہلوؤں۔ سارے نفسی کوائف کا بیان ہو سکتا ہے"۔

---

[1] اردو شاعری پر اک نظر صفحہ ۲۰۳ از کلیم الدین

حالی مثنوی کی تعریف میں اس طرح قصیدہ گو ہیں۔

"الغرض[1] جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں۔ ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جسکی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا تصوف میں ظاہراً ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئیں۔"

عام طور پر کسی قصہ کے چار عناصر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پلاٹ۔ کردار۔ منظر نگاری اور زبان دادا۔ اور باقی تمام چیزیں کسی نہ کسی طرح انہیں کے تحت آ جاتی ہیں۔ البتہ ہم دو کا اور اضافہ کرتے ہیں۔ زمان و مکاں اور نظریہ حیات۔ ارسطو ان سب میں پلاٹ کو سب سے زیادہ اہم خیال کرتا ہے پلاٹ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے اندر اس طرح کھو دیتا ہے کہ انسان اس کا فریب جانتے ہوئے بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ پلاٹ کے بغیر بھی قصہ مکمل ہو سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مصنف کے ذہن میں جو خیال پرورش پا رہا ہے دراصل وہی پلاٹ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پلاٹ کی اہمیت کردار کے بعد آتی ہے۔ کردار قصہ کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتے ہیں اور قصہ کے واقعات ان کو بناتے یا بگاڑتے رہتے ہیں۔ مثنوی کی عظیم دنیا میں کرداروں کی کیا کمی۔ شہنشاہ سے لے کر فقیر

[1] مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۱۶۶ از حالی

تک اور نیک سے لے کر بد تک اپنے اپنے رنگ میں مست نظر آئے گا
دراصل مثنوی نگار کا فرض ہے کہ ان کرداروں کو ان کا صحیح مقام
دے۔ ورنہ ذرا سی لغزش اس کے تمام کارناموں پر پانی پھیر سکتی ہے
اسی کے ساتھ واقعہ نگاری کا نمبر آتا ہے۔ ایک اچھے واقعہ نگار سے
ہم امید کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھا مصور بھی ہوگا۔ جذبات انسانی کی
تصویر کشی۔ تعلقات کا اظہار یہ وہ مراحل ہیں جن سے دامن بچا کر
گذرنا غیر ممکن ہے۔ وہ ان خاکوں میں رنگ آمیزی اس طرح کرتا ہے
کہ تصویر مکمل ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تمام باتیں اسی وقت
ممکن ہیں جب شاعر کا اسلوب اور طرز نگارش اچھوتا ہو۔ اس کو زبان
وبیان پر پوری قدرت ہو۔ میرانیس کے یہاں اس قسم کی مثالیں کثرت
سے مل جاتی ہیں۔ مثلاً

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اس کے بعد زمان و مکان کا درجہ ہے۔ شاعر کا فرض ہے کہ واقعہ اور
اس کے ماحول میں مطابقت کا خیال رکھے۔ بقول جین آسٹن "اگر تمہارے
کرداروں کے لئے آئرلینڈ جانا ضروری ہے تو ان کو جانے دو لیکن تم خود
ان کے ساتھ ہرگز مت جاؤ چونکہ تم ناواقف ہو" ایک مثنوی نگار جب
کوئی چیز پیش کرتا ہے تو اس کا ایک مخصوص نظریہ حیات ہوتا ہے۔ اسکی
مخصوص ذہنیت اپنے دماغ میں ایک مخصوص نظام کو مرتب کرنے لگتی

ہے۔ اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں پر سطحی شاعر اور عظیم شاعر میں فرق نمایاں ہے۔

ایک مثنوی نگار کو ہر فرد کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے ہمدردی کرتا ہے۔ اور بعض اوقات اپنی شخصیت کو کردار کی شخصیت میں گم کر دینا پڑتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں اور پلاٹ سے اپنے دور کی نمائندگی کراتا ہے۔ ہر شاعری خواہ وہ غزل ہو یا نظم، قصیدہ ہو یا مثنوی اپنے دور کی عکاس ہوتی ہے جس کو ہمارا شاعر "روح عصر" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ میر حسن کے کردار فیروز شاہ اور ماہرخ اور نسیم کے کردار" بکاؤلی اور اندر کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتے تو بھی اُن سے اس دور کے دل و دماغ اور ذہنی نشو و نما کا تو اندازہ ہو جاتا ہے۔

"جادو[1]۔ بھوت۔ پریت کا تصور اس سائنس کی دنیا میں کافی حد تک فنا ہو چکا ہے اور یہ بھی امر بدیہی ہے کہ ان چیزوں کا وجود اس دور میں بھی نہ تھا جب شاعران کے نغمے الاپ رہے تھے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کے دل و دماغ پر ان کا اثر کارفرما تھا ...... آج ہم کو جن باتوں پر ہنسی آتی ہے وہ کبھی ہماری زندگی کے حقائق کے ساتھ اس طرح پیوست تھے جیسے گوشت سے ناخن"

کلیم الدین کو مثنوی پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ "جو دنیا مثنوی کی ہوتی ہے وہ انسانی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے"۔ حالی مثنوی کے شکوہ گذار ہیں کہ" ان میں (مثنویوں میں) قطع نظر اس کے کہ ناممکن اور

---

[1] مقدمہ مثنوی سحر البیان صفحہ ۵ مرتبہ ظہیر احمد صدیقی

فوق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے۔ اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے ادا نہیں ہوتے"۔

حالی اور کلیم الدین کے یہ اعتراض اپنے اندر کافی وزن رکھتے ہیں مگر ہمارے سامنے ارسطو اور سیول کی مثال ہے۔ ارسطو کے نزدیک فنکار وہ ہے جو TRUTH کو پیش کرے وہ نہیں ہے جو صرف FACTS بیان کردے۔ سچائی وہ ہے جو مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچائے کہ زندگی میں ایک گہرائی اور وسعت ہے۔ ارسطو نے فنکار کو نصیحت کی ہے کہ اپنے فن کو تباہ نہیں کرنا چاہیے۔ زندگی کے معمولی حقائق کو نظر انداز کر دیا جائے تو حرج نہیں ہے۔ مگر اس کی اصل صداقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ اس میں کچھ غیر عقلی عناصر ہی کیوں نہ شامل ہوں۔ اسی طرح سیول (SEVIL.) نے کہا ہے کہ فنکار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے تصور کا ساتھ دے اور اپنے دائرہ عمل سے باہر جانے کی کوشش نہ کرے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فنکار جانتا ہو یا نہ جانتا ہو بہر حال اسکی تخیلی دنیا اگر مکمل طور پر نہ سہی تاہم کچھ نہ کچھ اس دنیا کا عکس ہے۔

یہی سبب ہے کہ اس سائنس کی دنیا میں جب دیو پریوں کے قصے سنتے ہیں تو ہم ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم ان کے اعمال اور کردار کو اس دنیا کے افراد سے موازنہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ کردار جو مثنوی کی خیالی دنیا میں رہتے بستے ہیں۔ جن کو انسانی ذہن نے تخلیق کیا ہے ان سے انسان خود اپنا موازنہ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

حالی مثنوی کے لئے چند شرائط لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ ہر مثنوی کو اسی معیار سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ مقدمہ شعر و شاعری میں یوں رقم طراز ہیں

۱۔ ربط کلام کا خیال رکھنا۔ خصوصاً جبکہ اس میں کوئی قصہ بیان کیا جا رہا ہو۔ (اسی ربط کو ارسطو "تناسب۔ نظم اور وحدت" کے نام سے یاد کرتا ہے)۔

۲۔ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد فوق العادت باتوں پہ نہ ہو۔

۳۔ مبالغہ اس قدر نہ ہو کہ کلام کو سُبک و حقیر بنا دے۔

۴۔ قصہ مقتضائے وقت کے موافق ہو۔

۵۔ اس بات کا لحاظ رکھنا کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب کرے۔

۶۔ اہم واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا اور ضمنی باتوں کو رمز کنایہ میں ادا کرنا۔

۷۔ عریانیت اور فحاشی سے دامن بچانا اور اگر کسی بات کا کہنا ناگزیر ہو تو اشارات سے کام لینا۔

آیئے آج حالی کے ان اصولوں کو کسوٹی بنا کر گلزار نسیم کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس مثنوی کی اہمیت ہمارے ادب میں کیا ہے۔

نسیم کی زندگی و سیرت کے اہم پہلو

پنڈت دیا شنکر کول نام نسیم تخلص لکھنؤ وطن تھا۔ سلسلہ خاندان کشمیری پنڈتوں

سے ملتا تھا۔ والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔ ۱۲۲۷ھ میں پیدا ہوئے اس زمانہ کے دستور کے مطابق اُردو فارسی کی تعلیم پائی۔ طبیعت میں جولانی اور ذہن میں تیزی تھی۔ تھوڑی عمر سے شعر کہنے کا شوق پیدا ہو گیا شاہی فوج میں وکیل تھے۔ گو شاعری اور فوجی ملازمت میں ایک قسم کا بُعد ہوتا ہے مگر نسیم کی فطری طباعی اِن قیود کو کیا خاطر میں لاتی۔ اس زمانہ میں آتش کی آتش بیانی کے چرچے تھے۔ ان کے کلام سے متاثر ہوئے اور جاکر زانوئے تلمذ تہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر بتیس سال کے قریب تھی۔ شروع میں غزل گوئی کا ولولہ تھا مگر قدرت کو ان سے دوسرا کام لینا تھا۔ اس لئے جلد مثنوی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے ہر جگہ چرچے تھے۔ ان کو یہ طور کچھ ایسا بھایا کہ غزل کو چھوڑ کر مثنوی کو اپنایا۔ اور گل بکاؤلی کا قصہ جو نثر میں تھا اس کو نظم کا جامہ پہنایا اور اپنے تخلص کی مناسبت سے "گلزار نسیم" نام رکھا کہا جاتا ہے کہ پہلے اس مثنوی کی ضخامت بہت تھی جب استاد کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے تو انہوں نے کہا کہ "ارے بھائی اتنی بڑی مثنوی کون پڑھے گا۔ یا تم پڑھو گے کہ تم نے تصنیف کی ہے یا میں اصلاح کے خیال سے ایک دفعہ پڑھ جاؤں گا۔" استاد کی بات دل کی گہرائیوں تک اتر گئی۔ چنانچہ نظر ثانی میں جن اشعار کو زائد سمجھا اُن کو قلم زد کر دیا۔ اس طرح مثنوی کا مختصر مگر بے داغ مجموعہ تیار ہو گیا۔ آتش کی اصلاح نے اس کو اور بھی چار چاند لگا دئے۔ سحر البیان کی

شہرت کے ساتھ ساتھ گلزار نسیم نے بھی اردو ادب میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کرلیا۔ گلزار نسیم کا سال تصنیف سنہ ۱۲۵۴ھ اور سال اشاعت سنہ ۱۲۶۰ھ ہے۔ ابھی مثنوی کو شائع ہوتے ایک سال کا ہی زمانہ گذرا تھا کہ سنہ ۱۲۶۰ھ میں نسیم نے ہیضہ میں مبتلا ہو کر سفر آخرت کیا[۱]

نسیم کی سیرت کے متعلق اصغر گونڈوی لکھتے ہیں:۔

"نسیم کشمیری تھے۔ کشمیریوں کا عام خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے علوم وفنون اور سوسائٹی کی عام تہذیب کو بہت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اکثر زندہ دل۔ یار باش۔ ملنسار اور خندہ رو ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب میں سخت ہوتے ہیں مگر متعصب نہیں۔ نسیم اپنے اس قومی وصف کا اس طرح اظہار کرتے ہیں ؎

خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر نیرنگ نسیم باغ کشمیر"

نسیم کا عام انداز بالکل لکھنؤ کا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اس زمانہ کے عام مذاق کے موافق ایک مسلمان کی طرح قلم سے حمد حق و مدحت پیمبر کا کام بھی لیتے ہیں اور اس کو مطیع پنجتن بھی قرار دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ استخارے کی رسم سے بھی باخبری کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ ایک ہنس مکھ اور ملنسار انسان تھے۔ ان کی زندگی لکھنؤ کی رعنائیوں میں گذری مگر ان کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔ انہوں نے اس کی خوبیوں کو اچھی

---

[۱] تاریخ ادب اردو۔ از سکسینہ

[۲] یادگار نسیم صفحہ ۳ از اصغر گونڈوی

طرح جذب کر لیا اور خامیوں سے دامن بچا گئے۔ اگر مثنوی میں کہیں کوئی شوخ رنگ آگیا ہے تو الفاظ کا ایسا باریک پردہ ڈال دیا ہے کہ نظریں اس میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔

ماحول دلّی میں مغلیہ اقبال کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں سے سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ دلّی کا تخت اب برائے نام رہ گیا تھا۔ نوابین لکھنؤ کی قدردانی باکمالان دلّی کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس وقت علم و ادب کی محفلیں دہلی سے اجڑ کر لکھنؤ میں جم گئی تھیں۔ نیا نظام پرانے اور فرسودہ نظام کو رفتہ رفتہ پیچھے کی طرف ڈھکیل رہا تھا۔ زمانہ کی نئی اقدار کا تسلط ہو رہا تھا۔ قدیم اقدار کے نباہنے والے وہ اُمرار اور نوابین تھے جن کے قدم لکھنؤ میں جمے ہوئے تھے۔ مگر زمانہ کے نئے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت ان لوگوں میں ہرگز نہیں تھی۔ زوال کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور ذہنی اعتبار سے اُن کو مفلوج کہنا غالباً غلط نہ ہوگا۔ یہ عروج و اقبال بیمار کا سنبھالا تھا۔ ع

آثار کہہ رہے تھے عمارت قدیم تھی

اخبار انتقاد لکھتا ہے:۔

"یہ ادبار نصیب لوگ اسے عروج و اقبال و فراغ بالی کا زمانہ

ل مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۹۳ از انتقاد

سمجھے ہوئے تھے۔ سایہ کو اصل شے اور تصویر کو زندہ پری خیال
کرتے تھے۔ جو جدت تھی وہ جھوٹی۔ جو طباعی تھی وہ برائے
نام۔ حوصلے پست تھے اس لئے ان کے شوق بھی ذلیل تھے
یہ لوگ لکیر کے فقیر تھے اور اسی میں نئی شگوفہ کاریاں کرکے اپنی
مردہ طبیعتوں کو جسے وہ زندہ دلی کہتے تھے ابھارتے تھے"۔

اس وقت لکھنؤ علم و ادب کا مرکز تھا۔ آتش۔ ناسخ۔ صبا کے
نغموں سے محفلیں گونج رہی تھیں۔ ان کی زباں دانی اور علم و ادب
کے چرچے ہر جگہ ہو رہے تھے۔ مگر ایک زوال آمادہ قوم کا خاصہ ہے
کہ خیالات اور معانی کی جگہ وہ الفاظ کے ظاہری حسن پر زور
دینے لگتی ہے۔ شاعری لطیفہ کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ یا پھر
چیستاں بن کر انسانی دماغوں کی ورزش کا وسیلہ بن جاتی ہے
لفظی نزاکتیں۔ صنائع و بدائع کی کثرت یہ سب لکھنؤ اسکول
کا خاصہ ہے۔ یہ امور جن پر آج ہم کو ہنسی آتی ہے کل تک لٹریچر
کی جان بنے ہوئے تھے۔ جن واقعات کو ہم وہم و خیال کا کرشمہ کہا
کرتے ہیں وہ اس دور میں اعتماد و یقین کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
واقعات کو جس قدر الفاظ کے گورکھ دھندے میں پیش کیا جاتا
تھا اسی قدر اس دور کے لوگ اس کو پسند کرتے تھے۔ اس دور
میں کوئی سیاسی آویزش تو نظر نہیں آتی مگر نئی اور پرانی اقدار کی ٹکر
ضرور نظر آتی ہے۔ اور اسی ٹکراؤ میں دو قوتوں (نئی اور پرانی) کا

فیصلہ بھی پوشیدہ تھا۔ لوگ پیچھے کی طرف دیکھ رہے تھے اور زمانہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ اگر ہم نے نئے رجحانات کو نہ سمجھا تو فنا ہو جائیں گے۔ اسی دور میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو اپنی قدامت پرستی کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کو تیار نہیں تھے اور کچھ وہ جن کو آنے والے دور کا کسی قدر اندازہ ہو گیا تھا مگر زمانے کے ہاتھوں مجبور تھے۔ لیکن ایسے لوگ صرف انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ زیادہ تعداد انکی تھی جو ماضی کے دھندلکوں میں مستقبل کے راستہ کو فراموش کر چکے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں یہی عالم تھا۔ چنانچہ اس دور کی شاعری کی یہ کیفیت تھی۔

"اصل شاعری تو ہوا ہو گئی تھی۔ فقط الفاظ کا گورکھ دھندا رہ گیا جس پر لوگوں نے وہ داد دی اور واہ واہ کی کہ اچھے اچھے طباع لوگ اس دھوکے میں آ گئے اور اسی کو شاعری کی روح رواں سمجھنے لگے۔ اور وہ لفظی نزاکتیں پیدا کرنا شروع کر دیں کہ اس سے بڑھ کر خیال میں نہیں آسکتیں۔ یہاں تک کہ یہ طرز خاص اہل لکھنؤ کا حصہ ہو گیا۔"[1]

لکھنؤ نوابوں کی دنیا تھی جس میں عیش و عشرت مے و شاہد کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ یہاں جرات اور جانصاحب کے نغمے گونج رہے تھے یہاں جاگیردارانہ نظام تھا اور اس کے اثرات انسانی دل و دماغ پر بری طرح حاوی تھے۔ انہی حالات اور ماحول میں نسیم آنکھ کھولتے ہیں اور

---

[1] مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۹۳ از نقاد

اسی ماحول میں ان کی مثنوی "گلزارِ نسیم" جنم لیتی ہے۔

مثنوی گلزارِ نسیم

یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس کو پہلی مرتبہ نثر میں میر تقی ہوس نے پیش کیا۔ نسیم کو قصہ پسند آیا اور ۱۲۵۴ھ میں اسکو شعر کا جامہ پہنایا آج یہ مثنوی نسیم ہی کے نام سے منسوب ہو کر رہ گئی ہے اور میر تقی ہوس کا نام صرف خواص کے حلقہ تک محدود ہے۔ سحر البیان کی قدر و قیمت کا اندازہ میر حسن کو خود تھا چنانچہ انھوں نے کہا تھا۔

نئی طرز ہے اور نئی ہے یہ زباں — نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیاں
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام — کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام

اس قسم کی تعلی ہم کو نسیم کے یہاں نہیں ملتی۔ البتہ اس مثنوی کی اہمیت کا احساس ان کو بھی ہے۔ لہٰذا اس کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے — سلطانِ قلمروِ سخن تھے
آگے ان کے فروغ پانا — سورج کو چراغ ہے دکھانا
یہ بحر سخن بسا ہے باقی — دریا نہیں کار بند ساقی
طعنے سے زبان نکتہ چیں روک — رکھوالے مری اہل خامہ یا لوک
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے — مرکز یہ کشش مری پہنچ جائے

اور سچ تو یہ ہے کہ نسیم کی یہ دعا مقبول ہوئی۔ جب کبھی اردو شاعری کا تذکرہ آئے گا تو ممکن نہیں ہے کہ گلزار نسیم کا ذکر نہ آئے۔

اس مثنوی کے پورے ہونے پر خود مصنف نے تاریخ لکھی ہے

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد	گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید دلم نوید ہاتف دادہ	توقیع قبول رفعتش باد (۱۲۵۴ھ)

آیئے دیکھیں اس مثنوی کے بارے میں میاں آزاد کیا کہتے ہیں۔

"ہمارے ملک میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنہوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحر البیان اور دوسرے گلزار نسیم اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں۔ اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت وسقم کا حال پوچھے"[1]

احمد علی شوق مثنوی مذکور کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

"نسیمؔ مرحوم نے جس فصاحت کے ساتھ گلزار نسیم کو نظم کیا ہے میں اس کو نہیں پہونچ سکا۔ میں نے اپنی قوت شاعرانہ ایک حد تک "ترانہ شوق" میں صرف کی اور اس قدر صحیح ہے کہ ترانہ شوق کی تصنیف کے وقت گلزار نسیم میری نگاہوں کے سامنے تھی .... لیکن نسیم کی فصاحت بیانی نے میری یہ حالت کی کہ جا بجا دانتوں پسینہ آگیا"[2]

یہ مثنوی حسن وعشق کی ایک طویل داستان ہے۔ مگر اس کے ساتھ

---

[1] آب حیات صفحہ ۲۵۵ از آزاد

[2] مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۱۵۴ از احمد علی شوق

ہم کو اس دور کی زندگی کا ایک ہلکا سا نقشہ بھی نظر آجاتا ہے
گو ہم کو وہ بھرپور عکاسی تو نہیں ملتی جو سحرالبیان کا حصہ ہے تاہم
گلزار نسیم کے اشارے بھی ایک حد تک ہماری رہنمائی کرتے ہیں
جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ جس دنیا کی نسیم نے عکاسی کی وہ توہمات کی
دنیا تھی اور اس کے مزاج میں اس قسم کے اوہام بارت سے پرورش
پا رہے تھے۔ چنانچہ جب کوتوال شاہ زین الملوک کو شہر نگارین کے
متعلق خبر دیتا ہے تو بادشاہ کو یقین نہیں آتا مگر وزیر کو یقین آجاتا
ہے۔ اور عرض کرتا ہے۔

بولا کہ شہا یہ بات کیا ہے — نیرنگ و فسوں کا گھر بڑا ہے
ہر چند کہ طرفہ حال ہے یہ — کچھ دور نہیں مثال ہے یہ

اودھ کا جاگیردارانہ نظام جس میں عیش و عشرت کے سوا زندگی
کا اور کوئی مقصد ہی نہیں تھا لوگوں کی زندگی میں رچا ہوا تھا۔
اس زمانہ کے مشاغل کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی ہو سکے گا کہ
شہزادے ایک بیسوا دلبر نامی کے یہاں پہونچتے ہیں اور چوسر
میں ہار کر غلام ہو جاتے ہیں۔ اس بیسوا کا پیشہ یہ تھا کہ

جس شخص کو مالدار پاتی — باہر سے اسے لگا کے لاتی
بہلا کے جوئے کا ذکر اٹھا کر — چوسر میں وہ لوٹتی سراسر
جیت اس کی تھی ہاتھ جو کچھ آتا — اس کا کوئی ہتکنڈا نہ پاتا

دلبر طوائف ہے وہ اس سماج کی ایک نمائندہ ہے۔ اس کا ہر

پہلو سماج کی خصوصیات کا ایک نمونہ ہے۔ وہ ایک ادبی حیثیت کی طوائف تھی جس
نے اسکے یہاں بڑے امرا آتے ہیں۔ اس کا زیرِ بحث لوگوں کو لوٹنا اس سماج پر ایک زبردست تنقید ہے

نسیم کا زمانہ تکلفات لایعنی کا زمانہ ہے۔ ظاہری رسم و رواج کی دنیا میں نسیم کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان سے دامن بچا سکے۔ مثنوی کا طویل قصہ جس میں شاعر کی ذمہ داریاں کچھ بڑھ جاتی ہیں اس میں تکلفات لفظی کا اہتمام اور بھی دشوار تر مرحلہ ہے۔ پھر صرف قصہ کا بیان کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے کردار کے ساتھ مثنوی نگار کا کیا برتاؤ ہے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے۔ جہاں تک قصہ کے فرائض کا تعلق ہے۔ نسیم نے بڑی خوبی کے ساتھ اس کو نبھایا ہے۔ چکبست جو نسیم کے مداحوں میں سے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں

"ابھی[۱] تک مثنوی کے رنگ میں یکتائی کا سہرا میر حسن کے سر تھا اب گلزار نسیم کے بھی جا بجا چرچے ہونے لگے۔ جواہر سخن کے پرکھنے والے سمجھ گئے کہ مثنوی کیا لکھی ہے موتی پروئے ہیں۔"

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ابھی کل کی بات ہے کہ ادبی دنیا میں گلزار نسیم کی بدولت ایک ہلچل مچ گیا تھا۔ شرر نے نسیم کی اس مثنوی پر الزام لگایا کہ یہ آتش نے لکھ کر نسیم کو دیدی تھی۔ پھر تو ملک کے چپہ چپہ سے وہ لے دے شروع ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ بڑے سے بڑے سنجیدہ اور متین لوگ اس میدان

[۱] مضامین چکبست صفحہ ۱۲۵ از چکبست

میں ختم ٹھونک کر کود پڑے۔ یہ جنگ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ برقرار رہتی۔ تو غنیمت تھا مگر طنز و تشنیع کی وہ کیچڑ اچھالی گئی کہ توبہ بخدا۔ آج بھی لوگوں کی زبان پر "معرکۂ شرر و چکبست" کا تذکرہ باقی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اس مثنوی میں آتش کی اصلاح ضرور موجود ہے بلکہ یہ کہنا زیادتی ہوگا کہ بقول شرر[1]

"کوئی تعجب کی بات نہیں اگر آتش نے اس دلبستگی کی بنیاد پر جو انھیں تو عمر شاگردوں سے تھی اس کی تحریک سے یا اس کی مشق اولین دیکھ کے اس مثنوی کو تفنن طبع کے لئے پہ کہا ہو اور اس میں متعدد شعر یاد دیکھ کے اسے بجائے اپنے اس کی طرف منسوب کر دیا ہو"۔

شرر نے یہاں صرف قیاس پر ان بنیادوں کو قائم کیا ہے لیکن بغیر دلیل قوی دل یہ باور کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ نسیم کی مثنوی دراصل آتش کی فکر بلیغ کا نتیجہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نسیم کی آتش شوق کو بھڑکانے والی سحر البیان تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ استاد نے ان کی خامیوں کو دور کر کے شعر کا رتبہ اور بلند کر دیا۔ اس سلسلہ میں چکبست کی رائے قابل غور ہے۔ وہ کہتے ہیں۔[2]

"جو شخص اصول شاعری سے واقفیت رکھتا ہے وہ میرے

---

[1] معرکہ شرر و چکبست صفحہ ۵۶ از شرر

[2] مضامین چکبست صفحہ ۱۶۶ از چکبست

خیال ہی کی تائید کرے گا کہ شاعر کی طبیعت کا قدرتی رنگ ایک
ہی ہوتا ہے۔ یہی رنگ مختلف پیرایوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے
...... اب دیکھنا چاہئے کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص
کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ حضرت شرر کو بھی اس سے انکار
نہ ہوگا کہ آتش کی طبیعت کا رنگ خاص آمد ہے ۔ ان کی زبان
سے شعر ایسے نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر۔ برعکس اس کے گلزار
نسیم میں ہر شعر شروع سے آخر تک آورد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔"
اور یہ حقیقت ہے کہ گو نسیم آتش کے شاگرد تھے مگر ان کے کلام
میں وہ روانی اور بے ساختگی نہیں ہے جو آتش کے حصہ میں آئی
تھی۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ آتش کے یہاں تصنع کا پتہ ہی نہیں ہے
اس لئے کہ لکھنؤ کی عام فضا سے دامن بچانا ان کے لئے ممکن نہ تھا
تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ادب کی بے راہ روی کے خلاف پہلا جہاد
آتش ہی کے یہاں ملتا ہے۔ آتش کے رنگ سے جو لوگ واقف ہیں
وہ بخوبی جانتے ہیں کہ گلزار نسیم کا رنگ ان سے بالکل جدا گانہ ہے۔
ایک چیز اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ شرر اس کا راوی نسیم دہلوی
کے ایک شاگرد اشرف علی کو بتاتے ہیں۔ جنہوں نے اپنی آنکھ سے اس
مسودہ کو دیکھا تھا۔ اس اعتراض کے برخلاف ہم کو چکبست کے اس
جواب میں زیادہ وزن معلوم ہوتا ہے کہ نسیم دہلوی اور نسیم لکھنوی
سے اکثر ادبی چشمک رہا کرتی تھی۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ

ایک گروپ کے شخص نے دوسرے گروپ کے فرد کو اپنا مسودہ دکھایا ہو۔

بہر نوع اعتراض کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ ہر شخص کے متعلق یہ فتوی صادر کیا جا سکتا ہے کہ یہ اس کا کلام نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کی جولانی طبع کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دبستان لکھنؤ کی یہ پہلی مثنوی ہے جو اس آن بان کے ساتھ عالم وجود میں آئی۔ اصغر گونڈوی لکھتے ہیں۔

"ایسے زمانہ میں نسیم نے گلزار نسیم لکھی جو نہ صرف اپنے رنگ کی پہلی مثنوی ہے بلکہ اسے لکھنؤ اور لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اس مثنوی نے ایسی شہرت حاصل کی کہ ہر طرف لوگوں کو مثنوی لکھنے کا شوق اور حوصلہ پیدا ہو گیا۔"[1]

مثنوی کی قسمیں اور اس کے اجزائے ترکیبی

اُردو اور فارسی میں بے شمار مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ اگر مضامین کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بقول علامہ شبلی ان کے اقسام حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ رزمیہ جس کو انگریزی میں ایپک (EPIC) کہتے ہیں اور مغربی ادب میں اس کا کافی رواج رہا ہے۔

۲۔ اخلاقی جس میں کوئی فرضی یا اصلی قصہ کے پیرایہ میں مفید اور سبق آموز نتائج دکھلائے ہوں۔

[1] یادگار نسیم صفحہ ۹ از اصغر گونڈوی

۳۔ صوفیانہ۔ جس میں عشق حقیقی کا بیان ہو۔

۴۔ عشقیہ۔ جس میں مجازی محبت کا بیان داستان کی شکل میں ہو۔

گلزار نسیم بھی عشقیہ مثنوی ہے۔ اگر اس مثنوی کی تحلیل کی جائے تو مندرجہ ذیل اجزا ہوں گے۔

۱۔ پلاٹ۔ جس کو شبلی "حسن ترتیب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲۔ کردار۔

۳۔ جذبات نگاری

۴۔ منظر نگاری۔ جو مصوری کے ذیل میں آتی ہے۔

۵۔ زبان و ادا۔ اس کی مندرجہ ذیل مزید تقسیم ہو سکتی ہے:-

(ا) تشبیہ و استعارہ (ب) صنائع و بدائع

(ج) ایجاز و اختصار چستی بندش (د) ضرب الامثال

(ھ) روزمرہ

نسیم کے یہاں یہ آخری قسم سب سے اہم ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نسیم کی شہرت ان کے انداز بیان کے انوکھے پن سے ہوئی تو غلط نہ ہوگا۔ آئیے ان بنیادی عناصر کو لے کر گلزار نسیم پر ایک نظر ڈالیں۔

پلاٹ سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قصہ کی ترتیب کیسی ہے۔ مصنف نے اس وسیع دنیا کو کس طرح اپنے احاطہ میں لیا ہے۔ کسی قصہ کی تخلیق کی محرک وہ دلچسپی ہے جو انسان کے اندر اپنے ماحول سے پیدا ہوتی ہے

افراد یا کردار کو اس طرح پیش کرنا کہ زندگی کے واقعات باہم ایک دوسرے سے پیوست نظر آئیں۔ سب سے پہلے جو چیز اس کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس عظیم دنیا کے کن پہلوؤں کو تصرف میں لائے کہ ان متناسب اجزا کا مجموعہ اکمل بن جائے۔ کن واقعات پر زور دیا جائے اور کن کو صرف اشارتاً بیان کر دینے پر اکتفا کیا جائے۔ کن حقائق کو چھپا جائے۔ کن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس قسم کی قطع و برید ناگزیر ہے۔ پلاٹ کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ارسطو اس کا قائل تھا کہ خواہ کردار ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن عمل ہونا چاہیئے۔ اس سے غالباً اس کا مقصد یہ ہے کہ پلاٹ میں زندگی ہونی چاہیئے۔ سبھی پلاٹ کے لئے ابتدا۔ وسط اور انتہا کو لازمی خیال کرتے ہیں۔ مگر ارسطو کے نظریہ کے مطابق پلاٹ کے معنی ہیں کسی واقعہ کے مرکزی حصہ کو کردار کے ذریعہ سے نمایاں کر دینا۔ یہ لازمی نہیں ہے کہ واقعہ کو شروع ہی سے لیا جائے مگر یہ ضروری ہے کہ اس میں توازن۔ تناسب اور عظمت ہو۔ نہ اتنا طویل کہ لوگ گھبرا جائیں اور نہ اتنا مختصر کہ واقعات خلط ملط ہو جائیں پلاٹ کی حیثیت کرداروں سے بالکل الگ ہوتی ہے ہنری جیمس کے نزدیک اس قسم کی تقسیم مصنوعی ہے۔ وہ کہتا ہے "ہم کردار کو عمل کے وسیلہ سے پاتے ہیں۔ اور عمل پلاٹ ہوتا ہے"۔ پلاٹ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کسی کردار کے گرد پلاٹ کی

چہار دیواری اٹھائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں پلاٹ غیر مربوط ہوگا دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے سے ذہن میں پلاٹ کا خاکہ کھینچا جائے اس صورت میں کرداروں کو پلاٹ کا پابند ہونا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں کچھ فائدہ اور کچھ قباحت ہے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ پلاٹ اور کردار دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں پلاٹ کے لئے ہمارا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ اس کی کہانی دلچسپ اور تازہ ہو۔ اس کے اجزا متناسب و متوازن ہوں کسی قسم کا تضاد نہ ہو ورنہ پلاٹ معیار سے گر جائے گا۔ زندگی کچھ بے ترتیب واقعات کا نام ہے جب قصہ نگار ان کو ترتیب دے کر پیش کرتا ہے تو وہ پلاٹ کہلاتے ہیں۔

ہمارے قدیم قصوں کی بنیاد مافوق الفطرت امور ہوتے تھے ان کا مقصد اصلاحی نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک خیالی اور بے مقصد زندگی کو پیش کر کے اپنی تلخیوں کو کم کرنا مقصود ہوتا تھا۔ یہ ایک قسم کا فرار ہے جو انسان حقائق کے مقابلے میں اختیار کرتا ہے یہی سبب ہے کہ ان میں مبالغہ کی کثرت ہوتی ہے۔ لکھنے والا اپنے کو ایک خاص ڈھانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں زندہ تصویریں نہیں ہوتیں۔ البتہ ڈرامائی اجزا اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات کافی ہوتے ہیں۔ یہی انداز مثنوی گلزار نسیم کا بھی ہے۔ مثلاً جب تاج الملوک صحرائے طلسم میں پہنچا تو وہ پریزادوں

کی گفتگو نے اس طرح اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

مادہ سے یہ سن کے بول اٹھا نر
ہے طرفہ طلسم اس جگہہ پر
وہ پیڑ جو حوض پر لگا ہے
طوبیٰ سے خواص میں سوا ہے
اک سانپ ہے واں پہ چوٹ کرتا
مارے سے نہیں کسی کے مرتا
لیکن یہ جو بندۂ خدا جائے
تا حوض قدم قدم چلا جائے
لپکے گا خود اس کو دیکھ کر سانپ
منہ چادرِ آب میں یہ لے ڈھانپ
ابھرے گا نکلے جب یہ غوطا
بن جائے گا آدمی سے طوطا
اندیشہ نہ اپنے دل میں لائے
اڑ کر یہ اسی شجر پہ جائے
سب خشک ہیں ایک ہے ہری ڈال
دو رنگ کے پھل ہیں سبز اور لال
پہلے تو یہ لال پھل کو کھائے
انسان کا رنگ روپ پائے

اور اسی طرح حیرت انگیز کرشمے دوسرے پھل۔ لکڑی اور گوند کے بھی ہیں۔

غرض قدم قدم پر یہ حیرت ہوتی ہے کہ یا اللہ یہ انسانوں کی دنیا ہے یا طلسم ہوشربا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ قصہ نسیم کی تصنیف نہیں ہے اس لئے پلاٹ کا ڈھانچا بھی ان کے دماغ کا مرہون منت نہیں ہے۔ چونکہ اُردو شاعری فارسی کی تابع رہی ہے اس لئے اسکی ترتیب میں کافی حد تک فارسی کا دخل رہا۔ فارسی شعرا چونکہ اپنے کلام کی ابتدا حمد سے کرتے تھے اور اس کے بعد نعت و منقبت کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی کی تقلید اُردو شعرا نے کی۔

چنانچہ اس روایت کو ہر شاعر نے خواہ مسلمان ہو یا ہندو اپنے یہاں اختیار کیا۔ یہی سبب ہے کہ نسیم بھی اپنی مثنوی کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر — حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زباں کی پیش دستی

اس پر شرر کا یہ اعتراض بے جا ہے کہ ایک ہندو اس عقیدت کا اظہار نہیں کر سکتا صاحب شعر الہند بے قید کی مثنوی کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

"اگر اردو میں کوئی مثنوی میر حسن کے لئے نمونہ و مثال کا کام دے سکتی ہے تو غالباً یہی مثنوی تھی …… بے قید نے جس عمارت کی داغ بیل ڈالی تھی اس کے کنگوروں کو انہوں نے اور بلند کر دیا"[1]

کلیم الدین ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر چیز کو مغرب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھلا مثنوی کی خامیوں کو معاف کرنے والے کب ہیں مگر وہ بھی دبی زبان سے اس کی تعریف کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔[2]

"اس طرز کا میدان محدود ہے۔ بہت محدود ہے۔ اس رنگ میں ہر رنگ کے افسانے نہیں لکھے جا سکتے ……. سچ تو یہ ہے کہ

---

[1] شعر الہند حصہ دوم صفحہ ۱۷۳
[2] اردو شاعری پر اک نظر از کلیم الدین

یہ مثنوی عجوبہ روزگار ہے اور اپنی ندرت کی وجہ سے
تعریف کے لائق ہے۔"

غرض پلاٹ میں شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ ہے۔ درمیان
میں قصہ میں قصہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر درمیان میں یہ قصے نہ ہوتے
جب بھی اس کی دلآویزی میں کوئی فرق نہ آتا۔

گلزار نسیم میں ہم کو اس دور کے رسم و رواج کا اندازہ مکمل طور
پر نہیں ہو پاتا۔ البتہ کہیں کہیں اس کی ایک ہلکی سی جھلک ضرور نظر
آجاتی ہے۔ جو اتنی مختصر ہے کہ ہم کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔
تاج الملوک کی بکاؤلی کے ساتھ شادی کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں

حیرت نے آئینہ دکھایا　　شربت دیدار نے پلایا
جو چہرہ آتشیں پہ تل تھا　　اسپند نگاہ بدبدل تھا
جو گائنیں تھیں تہانے گائیں　　لیتے ہوئے نیگ اگ لائیں

یا ایک اور جگہ لکھتے ہیں:—

اشکوں سے شگون لیا قرالا　　آئینہ رخ پہ پانی ڈالا

شادی کے وقت آرسی مصحف کی رسم۔ مہمانوں کو شربت پلانا۔ نگاہ بد
سے بچانے کے لئے اسپند جلانا۔ گائنوں کا گانا۔ نیگ لینے کا دستور
شگون نیک کے لئے آئینہ پہ پانی ڈالنا۔ یہ تمام باتیں اس زمانہ کے
رسم و رواج کی عکاسی کرتی ہیں۔

کردار | کسی قصہ میں سب سے اہم چیز کردار ہے۔ گو ارسطو پلاٹ

کی اہمیت پر زور دیتا ہے مگر قصہ کی دلچسپی اور تناسب پیدا کرنے میں زیادہ ہاتھ کرداروں کا ہوتا ہے۔ مثنوی کے میدان میں سینکڑوں لوگ نظر آتے ہیں۔" مرد۔ عورت۔ آقا۔ نوکر۔ بچہ۔ بوڑھا۔ بادشاہ وزیر شہزادے۔ وزیرزادے۔ عالم۔ جاہل غرض آدمیوں کا ایک عظیم سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا ملے گا۔ ہر ایک کی خو بو جدا۔ رنگ ڈھنگ جداگانہ بول چال کا انداز منفرد۔ اس میں شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان تمام کرداروں کی خصوصیات کو قائم رکھے۔ اور پھر اس کی ذمہ داریوں میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کو ان کرداروں میں اتحاد قائم رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ شبلی لکھتے ہیں

"مثنوی[1] میں اس کا لحاظ نہایت ضرور ہے کہ ہر شخص کا ایک خاص کریکٹر قائم کیا جائے اور جہاں کہیں اس شخص کا ذکر آئے یہ کریکٹر بدلنے نہ پائے۔ کم سے کم یہ کہ ایسی کوئی بات نظر نہ آئے جو قائم کردہ کریکٹر کے خلاف ہو"

ایک موقع پر ارسطو کہتا ہے THE CHARACTER SHALL BE CAUGHT. اس سے اس کی مراد ہے کہ کرداروں میں آورد نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ قصے کی خاطر کرداروں کو بنایا گیا ہے۔ بلکہ ان کا ذکر اس طرح آئے جیسے ان کی جگہ کسی اور کردار کا بدل ممکن ہی نہ تھا۔ کرداروں میں زندگی ہو۔ ایسا معلوم ہو کہ وہ زمانہ سے جد و جہد کر رہے ہیں۔

[1] شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۲۲۶ از شبلی نعمانی

نہ کہ کٹھ پتلی کی طرح شاعر کے ہاتھوں میں گھوم رہے ہوں۔ پھر ہر کردار کی خصوصیت دوسروں سے نمایاں ہونی چاہیئے۔ کردار کو مافوق العادت بنا کر معمہ نہ بنا دیا جائے بلکہ اس کی زندگی عام انسانوں کی طرح ہو۔ زمانہ اور ماحول کے اثر سے اس میں تغیر و تبدیلی ہونی چاہیئے۔ لیکن یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ زندہ فرد اور قصہ کے کردار میں نمایاں فرق ہوتا ہے کہ ایک کی زندگی مسلسل ہوتی ہے اور دوسرے کی زندگی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ غیر معمولی واقعہ پر اثر انداز ہو کر اپنی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کی پوری عمر تو درکنار اس کی زندگی کا ایک دن بھی پورے طور پر نہیں دکھایا جا سکتا۔ اس لئے شاعر کردار کی زندگی میں سے بھی قطع و برید کرتا ہے اور اس کے خاص خاص عناصر کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ اجمالاً پوری زندگی کی ترجمانی ہو سکے۔

مثنوی کے اہم کردار زین الملوک۔ تاج الملوک۔ بکاؤلی پری دلبر۔ محمودہ۔ روح افزا پری۔ راجہ اندر اور رانی چترادت وغیرہ ہیں اس کے علاوہ اس مجمع میں کثرت سے دیو۔ جن۔ نجومی۔ ملازمین اور عوام ملتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مستعد نظر آتا ہے۔ مگر ان میں سب سے اہم رول تاج الملوک اور بکاؤلی کا ہے اس مثنوی میں ہم کو تاج الملوک کی کوئی واضح تصویر نہیں ملتی اور نہ ہم

بکاؤلی کی شکل و صورت کا مکمل نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ بس تاج الملوک کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ پیدا ہونے والا تھا تو نجومیوں نے پیشین گوئی کی تھی ؎

وہ نور کہ صدقے مہر انور | وہ رخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو | چشمک تھی نصیب اس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے | ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو | پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

بکاؤلی کو ہم پہلی مرتبہ اس وقت دیکھتے ہیں جب تاج الملوک پھول لے کر واپس لوٹ رہا ہے مگر پھر سوچا کہ کیوں نہ پری کے بھی درشن کر لیے جائیں۔ اس موقع پر بھی پری کی شکل و صورت کا اندازہ قطعاً نہیں ہوتا۔ شاعر کی تمام تر توجہ اس کے سونے کی مختلف ہیئتوں پر مبذول ہوتی ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنے انداز بیان کو ایک مخصوص تعیش پرستانہ ذوق پر صرف کرتا ہے۔ متانت کا تقاضا ہے کہ ہم ایسے اشعار کے اقتباس کرنے سے گریز کریں۔ البتہ اس سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کا انداز کچھ زیادہ بلند اور اعلیٰ نہیں ہے اس کے علاوہ ان دونوں کی زندگی میں کوئی ہل چل اور طوفان نظر نہیں آتا واقعات کا بہاؤ۔ آہستہ خرامی کے ساتھ جاری ہے۔ تاج الملوک میں جد و جہد اور کوشش کا مادہ ہے اس میں ذہانت تو نہیں ہے کہ

آنے والے مسائل کو بخوبی سمجھ سکے۔ البتہ اس کمی کو اس کی محنت پورا کر دیتی ہے۔ یہاں لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ تاج الملوک ایک قدیم روایت کا حامل ہے مگر اس کے ساتھ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے اپنے ماحول سے کشمکش کرتا ہے۔ اس کی ذات میں ہم کو کچھ صحت مند عناصر بھی ملتے ہیں۔ وہ تھکنے کا نام نہیں لیتا۔ وہ پھول کی تلاش میں پرستان بھی پہونچ جاتا ہے۔ دیووں سے بھی واسطہ پڑتا ہے مگر اس کا حسن تدبیر ان سب پر قابو پالیتا ہے۔ وہ دلبر بیسوا سے بازی جیت کر ایک بدترین رسم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ دیو زمانے کی مشکلات کی اور دلبر بیسوا دنیا کے تعیشات کی نمائندگی کرتی ہے۔ وہ دونوں پر قابو پا جاتا ہے۔ اور اپنی مقصد براری کے لئے آگے بڑھ جاتا ہے۔

بولی بہ ہزار عجز و زاری   تم جیتے میاں میں تم سے ہاری
لونڈی ہوں نہیں عدول مجھ کو   خدمت میں کرو قبول مجھ کو
بولا وہ کہ سن یہ ہتکنڈے چھوڑ   نقارہ در کو چوب سے توڑ
یہ مال یہ زر یہ جیتے بندے   یونہی انہیں رکھ بجنس جیسے
بالفعل ارم کو جاتے ہیں ہم   انشاء اللہ آتے ہیں ہم

دلبر اور محمودہ کی ذات ایک حادثہ کی طرح تاج الملوک کی زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ مگر یہ حادثہ بہت عارضی سا مطلوب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ پورے قصہ میں ان دونوں کا رول کچھ زیادہ نمایاں نظر نہیں آتا۔ محمودہ اور دلبر نہ ہوتیں اور

کوئی دوسرا راستہ بتانے والا ہوتا تب بھی قصّہ کی روانی میں کوئی فرق نہیں پڑتا - البتہ ایک چیز تاج الملوک کی زندگی میں کھٹکتی ہے اور وہ اس کا بکاؤلی پری سے محبت کرنا ہے - اگرچہ دلبر اس کو ملتبہ بھی کرتی ہے - بولی وہ سنو تو بندہ پرور - اس کے برخلاف میر حسن کے یہاں بے نظیر کا ماہرخ پری کی محبت کو ٹھکرا کے بدر منیر سے محبت کرنا فطری معلوم ہوتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی ذہنیت کی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔

گلزار نسیم میں قصے کے تمام کرداروں کی ہنسی قہقہے چھیڑ چھاڑ کی آوازیں کانوں میں آتی ہیں۔ مگر ان کی صورتیں نظر نہیں آتیں - ان کرداروں کے علاوہ جو دیر تک ہمارے سامنے رہتے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو ابھی آئے اور ابھی غائب - البتہ سب کی سیرت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ تاج الملوک کی سیرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔

شہزادہ ہنسا کہا کہ دلبر — کچھ بات نہیں جو رکھے دل پر
انسان کی عقل اگر نہ ہو گم — ہے چشم پری میں جائے مردم

زین الملوک کا صرف اس قدر تعارف کافی سمجھا جاتا ہے۔

پورب میں ایک تھا شہنشاہ — سلطان زین الملوک ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ — دشمن کش و شہر یار تھا وہ

محمودہ کے متعلق صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ

اس دیونی پاس اک حسین تھی — زنبور کے گھر میں انگبیں تھی

محمودہ نام دخت آدم لے آئی تھی دے کے دیونی دم

محمودہ نوع انسان سے نسبت رکھتی ہے۔ اس لئے وہ اس ماحول سے جو دیونی کا ہے ہر طرح کے آسائش و آرام کے باوجود اکتائی ہوئی ہے یہی سبب ہے کہ تاج الملوک کے پہونچنے پر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اظہار بھی ان الفاظ میں کرتی ہے۔

بولا وہ فسردہ دل سحرگاہ کیا سرد ہوا ہے واہ واہ

بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے جو غنچے کو گل کرے صبا ہے

بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں گل پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں

تاج الملوک کی زندگی میں ایک کمزور پہلو یہ بھی ملتا ہے کہ وہ ہر حسین شے پر مچل جاتا ہے۔ دلبر سے پیمان محبت باندھ کر محمودہ سے اظہار محبت کرتا ہے اور پھر بکاؤلی کی محبت کا بھی دم بھرتا ہے اور اسی طرح اگر اس کی زندگی میں اور عورتیں آتی رہتیں تو شائد اس کی محبت کا بھی سلسلہ دراز ہی رہتا "وہ عشق کرتے ہیں اور عشق بازی بھی کرتے ہیں"۔ غالباً یہ لکھنؤ کے نوابوں اور عوام کی زندگی کا نقشہ ہو جس کا لاشعوری طور پر اظہار ہو جاتا ہے۔

کرداروں کو پیش کرنے کے سلسلے میں چند باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:۔

(۱) کسی کردار کو پابند کر کے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ کردار کی شخصیت کو آزاد ہونا چاہیئے۔ قصہ نویس کا برتاؤ کردار کے ساتھ غیر جانبدارانہ ہونا چاہیئے

(۲) کردار کو مشینری کی طرح نہیں ہونا چاہیئے۔ اس سے کردار
کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نسیم
کے بیشتر کردار کسی مشین کی طرح کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں
زندگی مفقود ہے۔

(۳) قصہ کے ہیرو کا کردار انسان کا ہونا چاہیئے اس کو مافوق العادت
طاقت کا حامل نہیں ہونا چاہیئے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے تمام قدیم
قصے اسی قسم کے کرداروں سے پُر ہیں۔

جذبات نگاری

جذبات انسانی کے سیکڑوں پہلو ہیں۔ ایک قصہ میں سینکڑوں کردار ہیں۔ ہر ایک کا
منصب جدا۔ نوالفض جدا۔ ہر ایک کو اس کے مطابق دکھانا بڑی
ذمہ داری کا کام ہے۔ اس سلسلہ میں میر انیس کی ذات ضرور
ایسی نظر آتی ہے کہ انھوں نے اس فن کا حق ادا کیا ہے مثنویوں
میں سحر البیان اور زہر عشق کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ
ہے کہ جذبات انسانی کی جتنی دلفریب اور فطری تصویر اُن لوگوں
نے کھینچی ہے وہ اپنی جگہ شاہکار ہے۔ نسیم نے بھی اس میدان
میں گھوڑے دوڑائے ہیں۔ مگر الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر
رہ گئے ہیں۔ تاہم بعض جگہ اچھی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ مثلاً جب
بکاؤلی کو تاج الملوک کا پیام عقد دیا جاتا ہے تو اپنی رضامندی
کا اظہار کتنے دلچسپ اور نیچرل طریقہ سے کرتی ہے۔

اقرار میں تھی جو بے حیائی شرمائی لجائی مسکرائی

بکاؤلی کی ماں جب تاج الملوک اور بکاؤلی کو یکجا دیکھتی ہے تو غصہ میں جو اس کی کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ نسیم ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

بیٹی کی طرف کیا نظارہ جھلا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تو نے لٹوائی بہار باغ تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھا منے سے چل دور ہو میرے سامنے سے

نسیم کے اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ زبان و بیان پر کس قدر قدرت ہے

تھمتا نہیں غصہ تھا منے سے چل دور ہو میرے سامنے سے

بکاؤلی کو اس کی خواصیں سمجھاتی ہیں۔

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر
صورت تری زار ہو گئی ہے گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے
ہے ہے تری عقل کس نے کھوئی نا جنس کو چاہتا ہے کوئی

اور جب خواصیں دیکھتی ہیں کہ اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تو مجبور ہو کر کہتی ہیں۔

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار اب مان نہ مان تو ہے مختار
غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

اس کوشش کہ بکاؤلی جھنجھلا اٹھتی ہے۔

جھنجھلائی بکاؤلی کہ بس بس اب ایک کہو گی تم تو میں دس

مجبور جو ہوں تو میں نہیں کیا | مجبور جو ہوں تو میں نہیں کیا
مانا مری حالت اب ردی ہے | بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

منظر نگاری و واقعہ نگاری

شبلی کو شکایت ہے کہ اکثر شعراء جب کسی چیز کو بیان کرتے ہیں تو اس کے ایسے عام اور مبہم اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جو تقریباً ہر چیز سے منسوب کئے جا سکتے ہیں! حالانکہ واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جس شئے کی تعریف کی جائے وہ اس طرح ہو جیسے ایک ماہر فن کرتا ہے اس چیز کی جزئیات کو اس طرح نمایاں کیا جائے کہ اس کو دوسری چیزوں سے ممتاز کر سکیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا کرنے سے اس شئے کی مکمل تصویر سامنے آجائے۔ اگر وہ کسی مستبعد واقعے کا حال بھی بیان کر رہا ہو تو لوگ بے اختیار کہہ اٹھیں کہ ایسا بھی ممکن ہے یہ فنکارانہ جھوٹ اس کی صداقت کی دلیل سمجھا جائے گا۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نسیم کے یہاں واقعہ نگاری کو اگر اس معیار پر دیکھا جائے تو ہم کو ناامیدی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ واقعہ نگاری کے لئے انداز بیان سادہ اور جذبات فطری ہونے چاہئیں۔ جن کی عموماً نسیم کے یہاں کمی ہے۔ تاہم بعض جگہ واقعہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ جب تاج الملوک باپ سے ملا ہے اس وقت کا منظر ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں

منسد سے شہ اٹھ کے بے محابا | بولا بیٹے سے دبان بابا
روشن کیا دیدۂ پدر کو | مادر کے بھی چل کے آنسو پوچھو

مشتاق کو روبراہ پایا ۔ ہمرہ اسے تا بخانہ لایا
ماں نے دیکھا جو وہ دلاور ۔ اشکوں کے گہر کئے نچھاور
وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر ۔ مانند سرشک چشم مادر

راجہ اندر پریوں سے بکاؤلی کا حال دریافت کرتا ہے۔ پریاں کچھ خوف و ادب سے ، کچھ بکاؤلی کی مروّت کی وجہ سے اور کچھ نسوانی شرم کے باعث تاج الملوک اور بکاؤلی کے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہیں ۔ اس موقعہ پر ان کے اشارات کو نسیم نے اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی ۔ گویا سینما کی چلتی پھرتی تصویریں نظر کے سامنے جلوہ گر ہیں ۔

منہ پھیر کے ایک مسکرائی ۔ آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چیتون کو ملا کے رہ گئی ایک ۔ ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

مناظر فطرت کا بیان بھی اپنے اندر کافی اہمیت رکھتا ہے ۔ جس طرح ایک مصور اپنی تصویروں کے ذریعہ سے صورت حال کی نقاشی کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر کا تخیل کسی منظر کو الفاظ کے لباس میں نمایاں کر دیتا ہے ۔ جو لوگ کردار کے نازک خد و خال کو بے نقاب کرنے سے قاصر ہوتے ہیں وہ عام طور سے اس کی تلافی منظر نگاری سے کرتے ہیں ۔ یا جب کبھی کہانی کے فطری ارتقا میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس وقت شاعر کو منظر نگاری کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ ناول یا مثنوی میں اصل چیز کردار نگاری ہے اس

مشتاق کو روبراہ پایا ہمرہ اسے تا بخانہ لایا
ماں نے دیکھا جو وہ دلاور اشکوں کے گہر کئے نچھاور
وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر مانند سرشک چشم مادر

راجہ اندر پریوں سے بکاؤلی کا حال دریافت کرتا ہے۔
پریاں کچھ خوف و ادب سے، کچھ بکاؤلی کی مروت کی وجہ سے اور کچھ نسوانی شرم کے باعث تاج الملوک اور بکاؤلی کے تعلقات کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہیں۔ اس موقعہ پر ان کے اشارات کو نسیم نے اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ گویا سینما کی چلتی پھرتی تصویریں نظر کے سامنے جلوہ گر ہیں۔

منہ پھیر کے ایک مسکرائی آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

مناظرفطرت کا بیان بھی اپنے اندر کافی اہمیت رکھتا ہے۔
جس طرح ایک مصور اپنی تصویروں کے ذریعہ سے صورت حال کی نقاشی کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر کا تخیل کسی منظر کو الفاظ کے لباس میں نمایاں کر دیتا ہے۔ جو لوگ کردار کے نازک خدوخال کو بے نقاب کرنے سے قاصر ہوتے ہیں وہ عام طور سے اس کی تلافی منظر نگاری سے کرتے ہیں۔ یا جب کبھی کہانی کے فطری ارتقا میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو اس وقت شاعر کو منظر نگاری کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ناول یا مثنوی میں اصل چیز کردار نگاری ہے اس

میں منظر نگاری محض ضمنی چیز ہے۔ البتہ سفرنامے میں صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ منظر نگاری اگر پس منظر کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے تو مناسب ہے۔ منظر کی جزئی تفصیل بیان کرنا فضول ہے۔ صرف اس حد تک بیان کرنا لازمی ہے۔ جس حد تک وہ کردار نگاری میں معاون ثابت ہو۔ ڈکنس (DICKENS.) کے یہاں پس منظر استعارہ کے طور پر آتا ہے۔ اسی طرح جین آسٹن (JANE AUSTEN) چند الفاظ یا اشاروں کے ذریعہ پوری فضا سے روشناس کر دیتی ہے۔ کلیم الدین کو شکایت ہے کہ اردو مثنوی میں منظر نگاری کے فرائض ادا نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں۔

"یہ نہیں کہ فطرت کے مرقعے نہیں ملتے۔ ملتے ضرور ہیں لیکن دیکھی ہوئی چیزوں کا ذکر نہیں ملتا۔ برسات کی رنگینی۔ دریا کا سکون اور اس کی روانی۔ ہندوستان کے سر بفلک کوہ۔ آبشار۔ تاریک و خوفناک گھاٹیاں اس قسم کی چیزوں کی تصویر بالکل نہیں ملتی اگر کہیں ہے بھی تو محض رسمی۔ عموماً باغ کی تصویر کشی ہوتی ہے لیکن باغ بھی ایسا جسے فطرت نے نہیں لگایا ہے۔ ہر جگہ تصنع ہے۔ تمام بناوٹی غیر فطری چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔"[1]

ہم کو نسیم کے یہاں اتنی فطرت کی مصوری نظر نہیں آتی جتنی الفاظ کی ہے۔ وہ الفاظ سے رنگ برنگ کے پھول سجاتے ہیں مگر ان میں تازگی

[1] اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ ۲۱۰ از کلیم الدین

ہو سکتی ہیں۔ ایک تو کسی کردار کے عمل کو واضح کرنے کے لئے ہم کسی منظر کو پیش کرتے ہیں۔ جیسے کسی ڈرامہ میں سینری۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی کردار کی زندگی میں اس کے نقطۂ نظر کی شکل میں نمودار ہو۔ بہر حال نسیم کے یہاں منظر نگاری کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ مگر ہر جگہ ان کے الفاظ کے صنائع و بدائع کی گلکاریاں فطرت کے حسن سے ٹکراتی ملیں گی۔

زبان و ادا

ا۔ **تشبیہ و استعارہ**:۔ نثر ہو یا نظم ہم کو تشبیہ و استعارہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس تشبیہ و استعارہ کی وسعت کا کیا اندازہ۔ "اکثر موقعوں پر اس سے کلام میں جو وسعت اور زور پیدا ہو جاتا ہے وہ اور کسی طریقہ سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ بعض اوقات جب شاعر کوئی غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے ممکن الوقوع ثابت کرنے کے لئے تشبیہ کی ضرورت پڑتی ہے"۔ اس کے علاوہ اگر کسی نازک خیال کو بیان کرنے کے لئے ہم کو کسی نازک چیز کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہ نازک شے یہی تشبیہ و استعارہ ہے جب ہم نسیم کے یہاں اس وصف کو تلاش کرتے ہیں تو وہ انتہائی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر مرتبہ ایک نئے انداز سے مثلاً بکاؤلی کا فراق محبوب میں یہ حال تھا۔

صورت میں خیال رہ گئی وہ ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر فانوس خیال بن گیا سر

دیو اپنے بھائی کو بلاتا ہے ؎

اک ٹیکرے پہ گیا بلایا — وہ مثل صدائے کوہ آیا

تاج الملوک جب اپنی ماں سے ملتا ہے ؎

وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر — مانند سرشک چشم مادر

چند مثالیں اور سن لیجئے ؎

جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے

اس دیو کے آگے سے بڑھا وہ — سایا سا پہاڑ پر چڑھا وہ

بولی وہ کہ بخت تھا زبردست — خورشید کو ذرّے نے کیا پست

انساں سے جھجکی پری کی گردن — کانٹے سے رکا ہوا کا دامن

۲۔ صنائع و بدائع :۔ ہمارے ادب میں صنائع و بدائع کو جو اہمیت حاصل رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ کسی مکان کی خوبصورتی کا دارومدار کافی حد تک اس کی آراستگی پر ہے۔ کوئی بیل بوٹوں سے مکانوں کو آراستہ کرتا ہے۔ کوئی پھلواری سے اس کی رونق بڑھاتا ہے کوئی خوبصورت تصویروں اور نقشوں سے مزین کرتا ہے لیکن جب آرائش ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو وہ خوبصورتی نہیں بدنمائی پیدا کر دیتی ہے۔ یا اگر کسی شے کو اس کا حقیقی مقام نہ ملے تو وہ بدصورت معلوم ہوتی ہے۔ نسیم کی مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے یہاں اپنے ہاتھ کے تراشے بیل بوٹے ہیں۔ وہ فطرت کے حسن کا سہارا لینے کی بجائے اپنے ہاتھ سے گلدستوں کو سجاتا ہے۔ رنگوں کی

دلچسپ آمیزش اس کی آرائش کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔ صنائع و بدائع کی کثرت کے باوجود وہ کہیں پر بھدّے یا اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ کلیم الدین ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"نسیم[1] کی زبان میں سراسر تصنع ہے۔ لیکن یہ جان کر بھی طبیعت مسرور ہوتی ہے۔ شروع سے آخر تک یہ نظم ایک رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اس وجہ سے تصنع تصنع باقی نہیں رہتا۔

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

عیب عیب باقی نہیں رہتا۔ ہنر کی صورت اختیار کر لی ہے۔"

ذرا یہ انداز ملاحظہ فرمایئے۔

بولا وہ کہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا

بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دل سوزی کرے گا کوئی دل گیر

بولا وہ کہ رات کو افق میں — خورشید تھا آتشِ شفق میں

بولی وہ کہ ہر سے شب و روز — عالم میں رہو گے رونق افروز

ایک جگہ صنعت سوال و جواب کو یوں پیش کرتے ہیں۔ اختصار اور جزالت قابل دید ہے۔

پوچھا کہ طلب کہا قناعت — پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت

پوچھا کہ وہ ہے کہا کہ ہاں ہے — پوچھا کہ کہاں کہا یہاں ہے

کون سی صنعت ہے جو نسیم نے استعمال نہ کی ہو سچ تو یہ ہے

[1] اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ ۲۱۶ از کلیم الدین

کہ ان صنعتوں ہی کی وجہ سے نسیم کی نیک نامی یا بدنامی ہوئی۔ ان صنعتوں کی وجہ سے ان کو پیغمبر سخن مانا گیا اور انہی صنائع و بدائع کے باعث معرکہ شرر و چکبست وجود میں آیا۔ ایک ہی انداز تھا جس کو موافقین اور مخالفین نے اپنے اپنے طور پر سمجھا۔ انہی صنائع و بدائع کے استعمال نے امانت کو مبتذل شاعر بنا دیا اور انیس کو تخت سخن پر بٹھا دیا۔ غرض ذکر یہ ہو رہا تھا کہ نسیم کے کلام میں یہ انداز ایک عجب خصوصیت کا حامل ہے۔ اب ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ تجنیس[1] مضارع کی مثال سنیئے

ہے بحر سخن میں خامہ غواص ہر گوہر طلسم اخلاص

ایہام[2] (توریہ) کا انداز ملاحظہ ہو۔

خوشہ کوئی تاکتا ہوئے گوشے میں کوئی لگا نہ ہوئے

جیسے کہ ہو گرد باد برباد جب مٹھ کی رہی نہ بیخ و بنیاد

خوشبو ہی سنگھا گیا نہ بتلا او باد صبا ہوا نہ بتلا

تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد

صنعت ایہام تناسب[3]

چھوٹے قید فرنگ سے وہ داغا تو چلے تفنگ سے وہ

[1] ایسے الفاظ جنکے ہجے اور معنی مختلف ہوں مگر تلفظ ایک ہو۔

[2] ایک لفظ جس کے دو معنی ہوں۔ ایک مشہور اور کثیر الاستعمال اور دوسرا بعید ہو مگر معنی بعید مراد لیئے جائیں۔

[3] ایسے الفاظ جن میں بظاہر مناسبت معلوم ہوتی ہو مگر معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں

گلچیں کا جو ہاتے ہاتھ لوٹا — غنچہ کے کبھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
وہ سبزہ خط جو یاد آئے — جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے
کر یاد کہیں چہ ذقن کو — کر دے نہ کوئیں میں باؤلی ہو
تحریر کیا کہ بے مروت — آئینہ ہے تجھ پہ میری صورت

مراعات النظیر (تناسب)[1]

گلچیں کا جو ہاتے ہاتھ لوٹا — غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
اور خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس کیں نہ تو نے سنبل
وہ قطرۂ بارش جدائی — وہ غرقۂ بحر آشنائی
واں خرمنِ عیش پہ پڑی برق — یاں بحرِ فسوں میں یہیں ہوا غرق

حسنِ تعلیل[2]

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد — تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد

ایہام تضاد[3]

صورت تری زار ہو گئی ہے — گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے

تضاد[4]

لکڑی میں اثر یہ ہے کہ دشمن — بن جاتا ہے موم اگر ہو آہن

---

[1] ایک کلام میں متناسب اور غیر متضاد چیزیں مذکور ہوں۔
[2] کسی چیز کی کوئی وجہ بتانا جو حقیقت میں اس کی وجہ وہ نہ ہو۔
[3] دو لفظ ایسے استعمال کرنا جن میں تضاد کا شبہ ہو۔
[4] دو مختلف صفات کی چیزوں کا ہونا

تجنیس تام

پھر توڑیئے اس کے سبز پھل کو ‏ پھل کچھ اسے دے رہے گا کل کو

صنعت مشاکلہ[1]

بیں جا کے جلی تو کچھ نہیں ہائے ‏ ڈر ہے کہ نہ تجھ پہ آنچ آئے

آیئے اسی رعایت کی جس میں تشبیہات کو بھی دخل ہے چند مثالیں سنتے چلیئے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل ‏ سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سنبل مرا تازیانہ لانا ‏ شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

پھر آئیں خواصیں صورت بید ‏ ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں ‏ سوسن نے زباں درازیاں کیں

یا ایک اور جگہ لکھتے ہیں

پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا ‏ ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا

سختی سہی یا کڑی اٹھائی ‏ افتاد کہ تھی جو پڑی اٹھائی

وہ راگ کا دیکھنے لگا رنگ ‏ یاں پردے میں چھیڑ تھی خوش آہنگ

ذرا یہ تقابل ملاحظہ کیجئے

واں مہندی نے چومے پائے خورشید ‏ یاں سبز ہوا نہال امید

وہ واں پہ گلاب سے نہائی ‏ یاں تازگی آبرو نے پائی

---

[1] ایک لفظ جس کے ہیں تلفظ ایک ہوں مگر معنی مختلف ہوں

[2] دو امور پر جو اصلاً مختلف ہوں ظاہری مشابہت کی وجہ سے یکساں حکم لگانا

واں غازے سے رخ شفق ہیں خورشید   یاں جم گیا منہ پہ رنگ امید
افشاں ہوئی واں ستارہ افشاں   یاں جبینہ سے روشنی دوچنداں

۳۔ایجاز و اختصار:۔ نسیم کا سب سے بڑا کمال ایجاز و اختصار ہے۔ ان مضامین کو جن کو دوسرا شخص طویل پیرایہ میں بیان کرے گا نسیم چند لفظوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ اختصار کلام میں نسیم کو مہارت حاصل ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کرنا نسیم اور صرف نسیم کا حصہ ہے۔ اختصار کی تعریف یہی ہے کہ بڑے سے بڑے مطلب کو چند لفظوں میں اس طرح ادا کر دیا جائے کہ مطلب خبط نہ ہونے پائے۔ کلیم الدین لکھتے ہیں۔

"اردو شعراء[1] اپنی مثنویوں کا آغاز حمد و نعت سے کرتے ہیں..... ان حصوں میں صدق جذبات کی نوبت کم آتی ہے۔ یہ چیزیں رسمی ہیں ...... اس لئے آغاز مثنوی میں کچھ لطف نہیں آتا۔ نسیم اس رسم کو بہترین طریقہ سے غایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے ہیں"۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری   ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر   حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے   یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی   کرتا ہے زباں کی پیش دستی

صرف اتنا ہی نہیں چند مقام اور ملاحظہ فرمائیے اور نسیم کی جدت طبع

[1] اردو شاعری پر اک نظر صفحہ ۲۱۱ از کلیم الدین احمد

اور قدرتِ زبان کی داد دیجئے۔ صحرائے طلسم میں تاج الملوک اژدہے
کو دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک کالا سانپ اگلا اور اس کالے سانپ کے
منہ سے من نکلا۔ صبح کو کالے سانپ نے من کو نگل لیا اور اژدہا سانپ
کو نگل گیا۔ اتنی طویل بات کو نسیم ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں جو قابل تعریف ہے

جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا　　کالے نے من۔ اژدہے نے کالا

صحرائے طلسم کا ایک اور واقعہ کس قدر مختصر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

طوطا بن کر شجر پہ جا کر　　پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے پھل گوند چھال لکڑی　　اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

دلبر وہ تمام قصہ جو کچھ تاج الملوک کے ساتھ گذرا تھا چند لفظوں
میں بیان کرتی ہے۔ اختصار کی اس سے بہتر مثال نہیں ملتی۔

وہ جعل وہ ہار وہ غلامی　　وہ گھات وہ جینا تمامی
وہ دسترس اور وہ پائمردی　　وہ بے کسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر　　وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت　　محمودہ کی وہ آدمیت
تجویز کے وہ سرنگ کی راہ　　اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن، وہ پھول لینا　　وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ کود کے حق میں خضر ہونا　　وہ غول سے مل کے پھول کھونا
وہ بال کو آگ پہ دکھانا　　وعدے پہ وہ دیونی کا آنا
وہ نزہت گلشن نگاریں　　وہ دعوت بادشہ وہ تمکیں

گذرا تھا جو کچھ بیاں کیا سب ۔ پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب

یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس قسم کی چلنے کتنی مثالیں گلزار نسیم کے اندر موجود ہیں۔ راجہ اندر کی محفل کی داستان۔ بادشاہ کے دربار کی شان وشوکت اور اس کی داد و دہش۔ غرض ایک بحر زخار ہے جس کو نسیم نے کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اس صنف میں میر حسن ہم کو نسیم سے بہت پیچھے نظر آتے ہیں۔ میر حسن کی طول بیانی اور وہ بھی بے ضرورت ان کا عیب بن گئی ہے۔ مگر اس رمز کو نسیم نے سمجھ لیا اور بڑی خوبی کے ساتھ اس کو نبھایا۔

ضرب الامثال ضرب الامثال اور محاوروں کو ہمارے یہاں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب اشعار اپنی خوبی کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہو جاتے ہیں تو ان کی حیثیت ضرب المثل کی ہو جاتی ہے۔ کبھی شعر میں اتنی جامعیت ہوتی ہے کہ جب وہ حسب حال ہوتا ہے تو اس کو ضرب المثل کے نام سے پکارتے ہیں۔ نسیم کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے مل جائیں گی۔

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے ۔ دن گننے لگے خوشی کے مارے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں ۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

وہ بولی جو تو کہے زباں سے ۔ تاروں کو اتار دوں آسماں سے

غم براہ نہیں کہ ساتھ دیجئے ۔ دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجئے

انسان و پری کا سامنا کیا | مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے | جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

غرض بے شمار مثالیں ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ حق یہ ہے کہ ضرب الامثال کے برمحل استعمال نے نسیم کے کلام میں چار چاند لگائے ہیں۔

سلاست وروانی اور روزمرہ

سادگی کی تعریف میں شبلی کہتے ہیں "سادگی ادا[1] کے یہ معنی ہیں جو مضمون شعر میں ادا کیا گیا ہے بے تکلف سمجھ میں آجائے"۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ مضمون کے تمام اجزا اپنی بھرپور قوت کے ساتھ سامنے آجائیں۔ روزمرہ کا ایک سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مشکل سے مشکل بات روزمرہ کی زبان میں سہل بن جاتی ہے۔ آیئے نسیم کے یہاں اس کی مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

اک اُن میں سے چشم آشنا تھا | کوکا اسی شاہزادے کا تھا
بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں | دیکھا تو کہا مری نظر میں
صورت وہی رنگ روہی ہے | لہجہ وہی گفتگو وہی ہے

بکاؤلی کی پریشانی کا انداز نسیم نے جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ صرف انہیں کا حصّہ ہے۔

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل | جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون | ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

[1] شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۸۲ از شبلی

ہاتھ اُس پر اگر بڑا نہیں ہے　　بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

پتا بھی پتے کا جب نہ پایا　　کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون　　بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا　　اوپر کا تھا کون آنے والا

اس سلسلہ میں رام بابو سکسینہ کی رائے کافی اہمیت رکھتی ہے وہ کہتے ہیں۔

"اس[1] کا ایجاز۔ روانی۔ مناسبت الفاظ۔ برجستگی۔ محاورات نادر تشبیہات و استعارات یہ سب قابل تعریف ہیں۔ البتہ تصنع ضرور ہے اور اسی وجہ سے اس کی حقیقی دل آویزی اور تاثیر میں کمی ہے۔ فن کے لحاظ سے اور تخیل کے اعتبار سے یہ ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے

نسیم کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ انہوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو زبان پر صرف کر دیا تھا جس برجستگی اور صفائی کے ساتھ نسیم بات کہہ جاتے ہیں۔ اس تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ چند مثالیں سنتے چلیے۔

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں　　غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں　　گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں

منہ پھیر کے ایک مسکرائی　　آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتون کو ملا کر رہ گئی ایک　　ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

---

[1] تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۹۲ از رام بابو سکسینہ

راتوں کو جو گنتے تھے ستارے　　دن گننے لگے خوشی کے مارے

موازنہ حسن نسیم

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔
"ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحر البیان، دوسری گلزار نسیم"[1]

آیئے ہم دونوں مثنویوں کا موازنہ کریں۔ موازنہ سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ ہم کسی شاعر کو گھٹانے یا بڑھانے کی کوشش کریں گے بلکہ دونوں کے انداز بیان کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے کہ کون کس خصوصیت کا مالک ہے۔ اصغر گونڈوی کا خیال ہے کہ دونوں کا موازنہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ موازنہ اس وقت درست تھا جب کسی نے دوسرے کی مثنوی کو سامنے رکھ کر اس کی تقلید یا تردید کی کوشش کی ہوتی۔ یہ ضرور تھا کہ سحر البیان کی شہرت نسیم کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نسیم کو مثنوی کی طرف متوجہ کرنے والی شے مثنوی سحر البیان ہی تھی۔ مگر نسیم نے اس کا تتبع کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کی۔ اگر یہ صحیح ہوتا کہ گلزار نسیم نے سحر البیان کا انداز چرایا ہے تو کہیں تو سحر البیان کی جھلک نظر آتی۔ علاوہ اس کے کہ میر حسن کا قصہ ان کا خود ساختہ ہے اور نسیم نے

[1] آب حیات　　از محمد حسین آزاد

میر تقی ہوس کے قصہ کو نظم کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ میر حسن نے اپنا تمام زور بیان جذبات اور واقعہ نگاری پر صرف کیا ہے اور نسیم الفاظ کے تکلفات میں مصروف رہے۔ موازنہ کے سلسلہ میں ہم صرف چکبست کا قول نقل کئے دیتے ہیں اور یہی قول فیصل ہے۔

"اگر[1] کلام کی سادگی اور بے تکلفی کا لطف اٹھانا ہے تو میر حسن کی مثنوی دیکھو۔ اگر باریک بینی اور معنی آفرینی کا رنگ پسند ہے تو گلزار نسیم کی سیر کرو۔ .... میر حسن کے اشعار کا بے ساختہ پن اور سادہ پن دل پر عجب کیفیت پیدا کرتا ہے شب ہجراں کی بے قراری کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نسیم کے اشعار ایک دوسری ہی حالت پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، استعاروں کی ترکیب، تشبیہوں کی پختگی مصنف کی طبیعت پر زور ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ نازک خیالی اور بلند پردازی اس عالم کا اشارہ کرتی ہے۔ جہاں پہونچتے ہوئے ہمارے طائر خیال کے پر جلتے ہیں اگر صورت حال کا بیان میر حسن پر ختم ہے تو کلام کا معنی خیز ہونا نسیم پر۔ میر حسن کے اشعار ناخن بہ جگر ہیں۔ ان کا اثر بجلی کی طرح دل میں دوڑ جاتا ہے۔ نسیم کے اشعار الفاظ کی شستگی اور ترکیب

[1] مضامین چکبست صفحہ ۶-۷-۸ از چکبست

الفاظ کی چستی سے تاثیر کا طلسم بنے ہوئے ہیں۔ ایک کی زینت
حسن صورت سے ہے دوسرے کی شان لطف معنی سے قائم ہے
میر حسن سخن آفریں ہیں۔ نسیم معنی آفریں ہیں۔ میر حسن محاورہ اور روزمرّہ
کے بادشاہ ہیں۔ استعارہ و تشبیہ نسیم کا حصّہ ہے۔ مگر اتنا کہنا
ناانصافی نہیں کہ جو سوز و گداز میر حسن کے کلام میں ہے وہ
نسیم کے کلام میں نہیں۔"

یہاں ہم دونوں کے چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے دیتے ہیں تاکہ یہ مسئلہ اور صاف ہو جائے۔ بدر منیر کا بے نظیر کے غم میں یہ حال ہے ؎

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے رونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپنے — اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپنے
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

بکاؤلی کی غم تاج الملوک میں یہ کیفیت ہے ؎

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر — فانوس خیال بن گیا سر

میر حسن اپنے باغ کو اس طرح آراستہ کرتے ہیں ؎

کہیں زرد نسرین کہیں نسترن عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑے آب جو ہر طرف کو بہے کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر نشے کا سا عالم گلستان پر

آئیے ذرا نسیم کے باغ کی بھی سیر کرتے چلیں۔

کھٹکا جو لگا ہبا نوں کا تھا دھڑکا ہی دل کا کہہ رہا تھا
گوشے میں کوئی لگا نہ ہوئے خوشہ کوئی تاکتا نہ ہووے
گو باغ کے پاسباں غضب تھے خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے
نرگس کی کھلی نہ آنکھ یکچند سوسن کی زباں خدا نے کی بند

طوالت کے خیال سے ہم مزید مثالوں سے قطع نظر کرتے ہیں۔

خامیاں

عبدالحلیم شرر کا گلزار نسیم کے متعلق خیال ہے۔
"اردو کی ایک عجیب و غریب معرکہ آرا نظم ہے اگر اس کے محاسن کے لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ ان نظموں میں ہے جیسی کہ اردو شاعری کو اپنی اس صدی دو صدی کی عمر میں شاید دو چار ہی نصیب ہوئی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے معائب پر نظر ڈالی جائے تو اس سے زیادہ عیوب کسی اردو نظم میں کہیں نکلیں"۔[۱]
شرر کا یہ بیان تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ کافی وزن رکھتا ہے

---

[۱] مباحثہ گلزار نسیم صفحہ ۵۳ شرر

سچ ہے کہ بے عیب ذات خدا کی۔ مگر اچھا تھا کہ اس گلستاں میں پھولوں کے ساتھ کانٹے نہ ہوتے۔ چکبست نے تو نسیم کے نقائص پر بھی محاسن کا پردہ ڈالنا چاہا ہے اور شرر نے ان کے محاسن کو بھی نقائص کے رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر جہاں تک حالی کا تعلق ہے ہم ان کے فیصلہ کو قول فیصل کی حیثیت دے سکتے ہیں۔ ان کے اعتراضات ہمدردانہ بھی ہیں اور سخن گسترانہ بھی۔ کسی بڑے شاعر کے یہاں اگر کوئی خامی ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی عظمت میں کسی قسم کی کمی آگئی ہے۔ اسی کے ساتھ "ہیرو وارشپ" کو ہمارا ادب کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

۱۔ حالی کہتے ہیں کہ قصہ میں مافوق العادت واقعات اور مافوق الفطرت عناصر نہیں ہونے چاہئے۔ مگر پوری مثنوی گلزار نسیم کی بنیاد انہی دونوں پر ہے اور یہی دونوں باتیں ہیں جو انسانوں کی دنیا سے الگ کر کے ایک طلسمی دنیا میں لے جاتی ہیں اور انہی قسم کے بیانات کا سرا مبالغہ سے جاکر ملتا ہے۔ مثلاً آدمی کا طوطا بن جانا اور پھر اپنے اصلی روپ میں واپس آنا۔ ایک پری سے شادی۔ ہیرو کو دیکھ کر ہر ایک کا عاشق ہو جانا۔ غرض اس قسم کے بہت سے امور ہیں جو ناقابل فہم ہیں۔ جن کو پڑھ کر انسان دلچسپی تو لے سکتا ہے مگر عقل و سائنس کی دنیا میں ان کی قیمت کچھ نہیں ہوتی۔

۲۔ حالی کہتے ہیں کہ مبالغہ کو اہل بلاغت نے صنائع معنوی میں

شمار کیا ہے۔ مگر نہ اتنی کثرت ہو کہ مضمون کو سبک اور حقیر بنا دے۔
پوری مثنوی میں نسیم نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس مبالغہ کا سبب
ایک تو خود قصہ کا اقتضا ہے۔ اور دوسرے صنائع و بدائع میں
پھنس کر وہ مبالغہ کو غلو کی حد تک لے جانے پر مجبور ہوئے۔

۳۔ بعض جگہ شاعر نے مضمون کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے
مگر درمیان میں الفاظ چھوڑ دینے کی وجہ سے مطلب خبط ہو گیا ہے
مثلاً ؎

خوش ہوتے تھے طفل مہ جبیں سے ۔۔۔ ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو ۔۔۔ پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو ۔۔۔ چشمک تھی نصیب اس پدر کو

ان میں جب تک الفاظ کا رد و بدل نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ مطلب
صاف اور واضح ہو سکے۔

۴۔ ایسے مواقع پر جب ہیرو یا ہیروئن پر مصیبت پڑتی ہے اور
وہ قدرتاً اپنی زندگی تک سے بیزار نظر آتے ہیں۔ اس وقت شاعر اپنے
صنائع و بدائع کی دنیا میں گم نظر آتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہم تاج الملوک
یا بکاؤلی کی مصیبت کا بیان بھی لطف لے لے کر پڑھتے ہیں۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں ۔۔۔ آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ ۔۔۔ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یا غصہ کی کیفیت کو اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

وہ شعلۂ آتشیں لپک کے | بجلی سی گری چمک دمک کے
دونوں کی رہی نہ جان تن میں | کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

۵۔ نسیم کے یہاں بعض جگہ ناقص اور کمزور اشعار بھی ملتے ہیں جن سے فصاحت میں خلل پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

جاگی تو سب اس کے جوڑ کی تھیں | اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں
خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی | گاتی اور ناچتی بڑی تھی
دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی | شب کو اسے آدمی بناتی
غربت میں وطن کی دھن سمائی | اس فیل کو یاد ہند آئی

طوالت کے خوف سے ہم تفصیل سے قطع نظر کرتے ہیں ورنہ اہل ذوق سے یہ نقائص پوشیدہ نہیں۔

۶۔ مثنوی کے کردار اس دنیا کے فرد نہیں ہیں۔ اور جو اس دنیا کے فرد ہیں وہ فوق البشر ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں۔ اسلئے ہم ان کرداروں سے دلچسپی لے سکتے ہیں مگر ہمدردی نہیں کر سکتے۔ اسکے علاوہ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام کردار ایک خاص مشینری کے تحت کام کر رہے ہیں جن میں زندگی مفقود ہے۔ ہم کو ان کے قہقہوں اور باتوں کی آواز تو آتی ہے مگر وہ ہم کو نظر نہیں آتے۔ ان کا عمل فطری نہیں ہے جو لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکے۔

۷۔ جس طرح ضروری باتوں کا صراحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنا لازمی ہے اسی طرح ناگفتنی باتوں کا نہ بیان کرنا یا صرف کنایتہً ذکر کرنا مناسب ہے۔ ان باتوں کا تفصیل سے یا کھل کر بیان کرنا نازیبا ہے۔ عریاں باتوں کا تذکرہ اگر ناگزیر ہو تو اختیار برتا کہتے ہوئے گذر جانا اتنا برا نہیں ہے جتنا ان کو مزے لے لے کر بیان کرنا۔ نسیم کے یہاں عریانیت

کافی ہے۔ اس عریانیت پر انہوں نے الفاظ کا باریک پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے مگر اس کی وہی حالت ہوگئی ہے جو بارش سے بھیگ کر جسم پر کپڑوں کی ہو جاتی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہم قاصر ہیں۔

۸۔ گلزار نسیم کے کردار ایک قصہ یا کہانی کے کردار ہیں وہ کوئی معیاری کردار نہیں ہیں جنکو ہم اپنے لئے کوئی نمونہ بنا سکیں۔ تاج الملوک کی زندگی میں تلون مزاجی ہے۔ بکاؤلی کا کردار ایک بیسوا سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا۔ دلبر کے متعلق کہنا بے کار ہے اسکی زندگی کے متعلق خود مصنف کو اعتراف ہے۔ البتہ ان دونوں سے محمودہ کا کردار ذرا بلند نظر آتا ہے۔

۹۔ نسیم کے یہاں کہیں کہیں الفاظ اور طرز ادا غیر فصیح بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً روح افزا اپنی ماں کو اس طرح مخاطب کرتی ہے ؎

وہ شکر گذار روح افزا ماں سے بولی کہ حسن آرا

بکاؤلی تاج الملوک سے اس طرح کہتی ہے ؎

رو رو کے بکاؤلی دل افگار بولی کہ خدا کو علم ہے یار

تاج الملوک اور روح افزا سے پہلی ملاقات ہوتی ہے۔ پھر دونوں کے درمیان عہد محبت کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا مگر دونوں ایک دوسرے کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں ؎

بولا وہ کہ جی بجھا نہ جانی دیو آگ تو آدمی ہے پانی

بولی وہ کہ سن تو آدمی زاد وہ دیو ہے تیری کیا ہے بنیاد

مجھ پاس تو اک عصا ہے جانی اٹھی سے جدا نہ ہوگا پانی

یہاں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسیم نے صرف لفاظی کی خاطر اس انداز کو روا رکھا ہے۔

کتابیات:—

۱ تذکرہ شعرائے اُردو — نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی

۲ معرکۂ شرر و چکبست — محمد شفیع شیرازی

۳ تاریخ ادب اُردو — رام بابو سکسینہ

۴ مختصر تاریخ ادب اُردو — ڈاکٹر اعجاز حسین

۵ تاریخ مثنویات — مولوی جلال الدین جعفری

۶ مقدمہ شعر و شاعری — حالی

۷ آب حیات — آزاد

۸ شعرالعجم حصہ چہارم — شبلی

۹ یادگار نسیم — اصغر گونڈوی

۱۰ اُردو شاعری پر اک نظر — کلیم الدین

۱۱ مضامین چکبست — چکبست لکھنوی

۱۲ تذکرۃ البلاغت — ذوالفقار علی

۱۳ مثنوی سحرالبیان — ظہیر احمد صدیقی

۱۴ میرے متفرق مضامین

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری — ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر — حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے — یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے

ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی — کرتا ہے زبان کی پیش دستی

خواستگاری جنابِ باری سے مثنوی گلزارِ نسیم کی ترتیب کے واسطے

یارب مرے خامے کو زباں دے — منقارِ ہزار داستاں دے

افسانۂ گلِ بکاؤلی کا — افسوں ہو بہارِ عاشقی کا

ہر چند سنا گیا ہے اس کو — اردو کی زبان میں سخن گو

وہ نثر ہے داد نظم دوں میں — اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے — سلطانِ قلمروِ سخن تھے

آگے ان کے فروغ پانا — سورج کو چراغ ہے دکھانا

پر بجز سخن سدا ہے باقی ۔ دریا نہیں کاربند ساقی
طعنے سے زبانِ نکتہ چیں روک ۔ رکھ لے مری اہلِ خامہ میں نوک
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر ۔ نیرنگِ نسیمِ باغِ کشمیر
نقطے ہوں سپندِ خوش بیانی ۔ جدول ہو حصارِ سحر خوانی
جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے ۔ در کنز یہ کشش مری پہنچ جائے

داستان تاج الملوک شاہزادہ اور زین الملوک بادشاہِ مشرق کی

روداد زمانِ باستانی ۔ یوں نقل ہے خامہ کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ ۔ سلطان زین الملوک ذی جاہ
لشکرکش و تاجدار تھا وہ ۔ دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیئے تھے چار فرزند ۔ دانا عاقل ذکی خردمند
نقشا ایک اور نے جمایا ۔ پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
امید کے نخل نے دیا بار ۔ خورشید حمل ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہرِ انور ۔ وہ رُخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو ۔ چشمک تھی نصیب اس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفلِ مہ جبیں سے ۔ ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو ۔ پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفل ابتر ۔ مانند سرشکِ دیدۂ تر
پردے سے نہ دایہ نے نکالا ۔ پتلی سا نگاہ رکھ کے پالا

تھا افسر خسرواں وہ گلفام — پالا تاج الملوک رکھا نام

جب نام خدا جواں ہوا وہ — مانند نظر رواں ہوا وہ

آتا تھا شکار گاہ سے شاہ — نظارہ کیا پسر کا ناگاہ

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی — بینائی کے چہرے پر نظر کی

پھر لب شہ ہوئی خموشی — کی نور بصر سے چشم پوشی

دی آنکھ جو شہ نے رونمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی

ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا — اس ماہ کو شہر سے نکالا

گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور — خارج ہوا نور دیدہ کور

آیا کوئی لے کے نسخۂ نور — لایا کوئی جا کے سرمۂ طور

تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور — بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور

ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے — مختار ہے جس طرح نباہے

جانا چاروں شاہزادوں کا بہ تجویز کحال تلاش گل بکاؤلی کو

پایا جو سفید چشم صفحا — یوں میں قلم نے سرمہ کھینچا

تھا ایک کحال پیر دیریں — عیسیٰ کی تھیں اس نے آنکھیں دیکھیں

وہ مرد خدا بہت کراہا — سلطان سے ملا کہا کہ شاہا

ہے باغ بکاؤلی میں اک گل — پلکوں سے اسی پہ مارو چنگل

خورشید میں یہ ضیا کرن کی — ہے پھر گیا اُسی چمن کی

اس نے تو گل اسم بتایا — لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا

شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار / رخصت کئے شہ نے چار ناچار
شاہانہ چلے وہ لیکے ہمراہ / لشکر۔ اسباب۔ خیمے۔ خرگاہ
وہ بادیہ گرد خانہ برباد / یعنی تاج الملوک ناشاد
میدان میں خاک اڑا رہا تھا / دیکھا تو وہ لشکر آ رہا تھا
پوچھا تم لوگ خیل کے خیل / جاتے ہو کدھر کو صورت سیل
بولا لشکر کا ایک سپاہی / جاتی ہے ارم کو فوج شاہی
سلطان زین الملوک شہزور / دیدار پسر سے ہوگیا کور
منظور علاج روشنی ہے / مطلوب گل بکاولی ہے
گل کی جو خبر سنائی اس کو / گلشن کی ہوا لبھائی اس کو
ہمرہ کسی لشکری کے ہوکر / قسمت پہ چلا یہ نیک اختر

غلام ہونا چاروں شہزادوں کا چوسر کھیل کر دلبر بیسوا سے

نقطوں سے قلم کے مہرہ بازی / یوں لاتی ہے رنگ بد طرازی
یکچند پھرا کیا وہ انبوہ / صحرا صحرا و کوہ در کوہ
بلبل ہوئے سب ہزار جی سے / گل کا نہ پتا لگا کسی سے
وارد ہوئے اک جگہ سر شام / فردوس تھا اس مقام کا نام
اک نہر تھی شہر کے برابر / ٹھٹکے سیارے کہکشاں پر
اک باغ تھا نہر کے کنارے / جو پائے گل اس طرف سدھارے
دلبر نام ایک بیسوا تھی / اس ماہ کی واں محل سرا تھی

دروازے سے فاصلہ پہ گھر تھا — نقارہ پہ چوبدار در تھا
بیجا و بجا نہ سمجھے انجان — نقارہ بجا کے ٹھہرے نادان
آواز پہ وہ لگی ہوئی تھی — آپ آن کے ٹھاٹھ دیکھتی تھی
جس شخص کو مالدار پاتی — باہر سے اسے لگا کے لاتی
بٹھلا کے جوئے کا ذکر اٹھاکر — چوسر میں وہ لوٹتی سراسر
جیت اس کی تھی ہاتھ جو کچھ آتا — اس کا کوئی ہتکنڈا نہ پاتا
بلّی کا سر چراغ دان تھا — چوہا پاسے کا پاسبان تھا
اُلٹاتی اڑی پہ قسمت آسا — بلّی جو دیا تو موس پاسا
جیتے ہوئے بندی تھے ہزاروں — قسمت نے پھنسائے یہ بھی چاروں
صیادنی لائی پھانس کر صید — کرسی پر بٹھائے نقش اُمید
گھاتیں ہوئیں دلربائیوں کی — باتیں ہوئیں آشنائیوں کی
رنگ اس کا جما تو لائے چوسر — کھیلی وہ کھلاڑ بازی بدکر
وہ چھوٹ پہ تھی یہ میل سمجھے — بازی چوسر کی کھیل سمجھے
مغرور تھے مال و زر پہ کھیلے — سامان ہارے تو سر پہ کھیلے
بدبختی سے آخری جوا تھا — بندہ ہونا بدا ہوا تھا
دو ہاتھ میں چاروں اس نے لوٹے — پنجے میں پھنسے تو چھکے چھوٹے
ایک ایک سے رات بھر نہ چھوٹا — پو پھٹتے ہی جگ اُنھوں کا ٹوٹا
زنداں کو چلے مچل مچل کر — نردوں کی طرح پھرے نہ چل کر
لشکر میں سے جوگیا سوئے شہر — پانی سا پھرا نہ جانب نہر

جیتنا تاج الملوک کا دلبر بیسوا کو اور چھوڑ کر روانہ ہونا تلاش گل بکاؤلی میں

لانا زرِ گل جو ہے ارم سے — یوں صفحے پہ نقش ہے قلم سے
وہ ریگ رواں کا گردِ لشکر — یعنی تاج الملوک ابتر
حیران ہوا کہ یا الٰہی — لشکر پہ یہ کیا پڑی تباہی
اُٹھا کہ خبر تو لیجے چلکر — گزرا درِ باغ بیسوا پر
حیران تھا یہ بلند پایہ — نکلی اندر سے ایک دایہ
لڑکا کوئی کھو گیا تھا اُس کا — ہمشکل یہ مہ لقا تھا اس کا
بولی وہ نام کیا ہے تیرا — فرزند اسی شکل کا تھا میرا
بولا وہ نام تو نہیں یاد — طفلی میں ہوا ہوں خانہ برباد
لیکن یہ میں جانتا ہوں دلگیر — مادر تھی میری بھی ایسی ہی پیر
بیٹا وہ سمجھ کے جی سے اُس کو — گھر لائی ہنسی خوشی سے اُس کو
چلتے تھے ادھر سے وہ جواری — ایک ایک کی کر رہا تھا خواری
کہتے تھے فریب دو گے کیا تم — شہزادے نہ ہم نہ بیسوا تم
ذکر اپنے برادروں کا سُن کر — بولا وہ عزیز سُن تو مادر
کون ایسی کھلاڑ بیسوا ہے — شہزادوں کو جس نے زچ کیا ہے
بولی وہ کہ ہاں جوا ہے بد کام — دلبر اک بیسوا ہے خود کام
بلّی یہ چراغ رکھ کے شب کو — جو سر ہیں وہ لوٹتی ہے سب کو
پاسے کی ہے کل چراغ کے ساتھ — وہ بلّی کے سر یہ چوہے کے ہاتھ

شہزادے کہیں کے تھے بداقبال — بندے ہوئے ہار کر زر و مال
بھائی سے تھے جوشِ خوں کہاں جائے — صدمہ ہوا درد سے کہا ہائے
پاسے کا چراغ کا اُلٹ پھیر — سوجھا نہ اُنھیں یہ دیکھو اندھیر
سوچا وہ کہ اب تو ہم ہیں آگاہ — جیتے ہیں تو جیت لینگے ناگاہ
اک بلّی جو جھپٹی چوہے کو بھانپ — نیولے نے بھگا دیا دکھا سانپ
سمجھا وہ کہ ہے شگون نرالا — نیولا پکڑ آستیں میں پالا
چوسر ہی کے سیکھنے کو یکسر — گھوما وہ برنگِ نرد گھر گھر
ایک روز اُسے مل گیا امیر ایک — وہ صاحبِ جاہ دل سے تھا نیک
اشراف سمجھ کے لے گیا گھر — بخشا اُسے اسپ و جامہ و زر
اُس گل کے جو ہاتھ میں زر آیا — جانبازی کو سوئے دلبر آیا
ملتی تھی کھلاڑ ڈنکے کی چوٹ — نقّارہ و چوب میں چلی چوٹ
آواز وہ سن کے در پہ آئی — ہمراہ اسے لے کے اندر آئی
کام اس کا تھا السکہ کھیل کھانا — چوسر کا جا وہ کارخانا
وہ چشم و چراغ بیسوا کے — کرنے لگے تاک جھانک آ کے
نیولا وہ کہ مارِ آستیں تھا — چٹکی کے بجاتے ہی وہیں تھا
بلّی تو چراغ پا تھی خاموش — بل ہو گیا موش کو فراموش
ہنس ہنس کے حریف نے رُلایا — مانندِ چراغ اُسے جلایا
ہارے بہ ہزار بد دماغی — لی خضر نے غول سے چراغی
پاسے سے چلی نہ جعل سازی — اُجڑی وہ بسا بسا کے بازی

سب ہار کے نقد و جنس پارے — جیتے ہوئے بندے بد کے ہارے
بنیاد جو کچھ تھی جب گنوائی — تب خود وہ کھلاڑ بھرے آئی
پھر پاسے نے کی نہ پاسداری — ہمت کی طرح وہ دل سے ہاری
پاسے کی بدی ہے آشکارا — راجہ نل سلطنت ہے ہارا
دانا تو کرے کب اس طرف میل — ہارا ہے جوئے کے نام سے بیل
ہارے دیکھا جو بیسوا نے — بندہ کیا غیر کا خدا نے
سوچی کہ نہ اب بھی چال رہیئے — شادی کا مزا بحال رہیئے
بولی بہزار عجز و زاری — تم جیتے میاں میں تم سے ہاری
لونڈی ہوں نہیں عدول مجھکو — خدمت میں کرو قبول مجھ کو
بولا وہ کہ سن یہ ہتھکنڈے چھوڑ — نقارۂ در کو چوب سے توڑ
یہ مال یہ زر یہ جیتے بندے — یونہیں انھیں رکھ بجنس چندے
بالفعل ارم کو جاتے ہیں ہم — انشاء اللہ آتے ہیں ہم
بولی وہ سنو تو بندہ پرور — گلزار ارم ہے پریوں کا گھر
انسان اور پری کا سامنا کیا — مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا
شہزادہ ہنسا کہا کہ دلبر — کچھ بات نہیں جو رکھے دل پر
انسان کی عقل اگر نہ ہو گم — ہے چشم پری میں جائے مردم
یہ کہکے اٹھا کہا کہ لو جان — جاتے ہیں لکھا خدا نگہبان
دولت تھی اگرچہ اختیاری — پا مردی سے اس پہ لات ماری
جز جیب نہ مال پر پڑا ہاتھ — جز سایہ نہ کوئی بھی لیا ساتھ

درویش تھا بندۂ خدا وہ | اللہ کے نام پر چلا وہ

پہنچنا تاج الملوک کا سرنگ کھدوا کر باغ بکاؤلی میں اور گل لیکر پھرنا

کرتا ہے جو طے سواد نامہ | یوں حرف ہیں نقش پائے خامہ
وہ دامن دشت شوق کا خار | یعنی تاج الملوک دل زار
اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد | صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا | عنقا تھا نام جانور کا
مرغان ہوا تھے ہوش راہی | نقش کف پا تھی ریگ ماہی
وہ دشت کہ جس میں پر تنگ و دو | یا ریگ رواں تھی یا وہ رہرو
ڈانڈا تھا ارم کے پادشا کا | ایک دیو تھا پاسباں بلا کا
دانت اس کے تھے گورکن قضا کے | دو نتھنے رہ عدم کے ناکے
سر پیر پایا بلا کو اس نے | تسلیم کیا قضا کو اس نے
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک | فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
بے ریش یہ طفل نوجواں تھا | حلوائے دود بیگماں تھا
بولا کہ چکھوں گا میں یہ انساں | اللہ اللہ شکر احساں
شہزادہ کہ منہ میں تھا اجل کے | اندیشہ سے رہ گیا دہل کے
بل مارنے کی ہوئی جو دیری | سبحان اللہ شان تیری
اشتر کئی جاتے تھے ادھر سے | پر آرد و روغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا | غراتے ہوئے شکار لایا

اونٹوں کی جو لو تھیں دیو لایا ‌ دم اس کا نہ اس گھڑی سمایا
تیورا کے وہیں وہ بار بردوش ‌ بیٹھا تو گرا گرا تو بیہوش
چاہا اس نے کہ مار ڈالو ‌ یا بھاگ سکو تو راستا لو
وہ اونٹ تھے کاروانیوں کے ‌ سب ٹھاٹھ تھے میہمانیوں کے
میدا بھی شکر بھی گھی بھی پایا ‌ خاطر میں یہ اس بشر کے آیا
میٹھا اس دیو کو کھلاؤ ‌ گر گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو
حلوے کی پکا کے ایک کڑھائی ‌ شیرینی دیو کو چڑھائی
ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا ‌ حلوے سے کیا منہ اس کا میٹھا
کہنے لگا کیا مزا ہے دلخواہ ‌ اے آدمی زاد واہ وا واہ
چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو ‌ کیا اس کی عوض میں دوں میں تجھ کو
بولا وہ کہ پہلے قول دیجئے ‌ پھر جو میں کہوں قبول کیجئے
وہ ہاتھ پر اس کے مار کر ہاتھ ‌ بولا کہ ہے قول جان کے ساتھ
بولا وہ کہ قول اگر یہی ہے ‌ بد عہدی کی بر نہیں سہی ہے
گلزار ارم کی ہے مجھے دھن ‌ بولا کہ ارے بشر وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے ‌ اندیشے کا واں گزر نہیں ہے
واں موج ہوا ہوا ہے اژدر ‌ واں ریگ زمیں زمیں پہ اخگر
ہوتا نہ جو قول کا سہارا ‌ بچتا نہ یہیں تو خیر ہارا
رہ جا مرا بھائی ایک ہے اور ‌ شاید کچھ اس سے بن پڑے طور
اک ٹیکرے پر گیا بلایا ‌ وہ مثل صدائے کوہ آیا

حال اس سے کہا کہ قول ہارا | ہے پیر یہ نوجواں ہمارا
مشتاق ارم کی سیر کا ہے | کوشش کرو کام خیر کا ہے
حمّالہ نام دیونی ایک | چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک
خط اس کو لکھا بایں عبارت | اے خواہر مہرباں سلامت
پیارا یہ مرا ہے آدمی زاد | رکھیو اسے جس طرح مری یاد
انسان ہے چاہے کچھ جو سازش | مہماں ہے کیجیو نوازش
خط لے کے بشر کو لے اُڑا دیو | پہنچا حمّالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا | بھیجے ہوئے کو گلے لگایا
اس دیونی پاس اک حسیں تھی | زنبور کے گھر میں انگبیں تھی
محمودا نام دختِ آدم | لے آئی تھی دیکھے دیونی دم
جوڑا ہم جنس ہاتھ آیا | محمودا کے گلے لگایا
دن بھر تو الگ تھلگ ہی تھے وہ | دو وقت سے شام کو ملے وہ
تھے ضبط و حیا کے امتحاں میں | پردہ رہا ماہ میں کتاں میں
آپس میں کھُلے نہ شرم سے وہ | خاطر کی طرح گرہ رہے وہ
بولا وہ فسردہ دل سحرگاہ | کیا سرد ہوا ہے واہ وا واہ
بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے | جو غنچے کو گُل کرے صبا ہے
بولا وہ یہی تو چاہتا ہوں | گُل پاؤں تو میں ابھی ہوا ہوں
پیراہنِ گُل کی بو تھی مطلوب | یوسف نے کہا وہ حال یعقوب
اول کہی بدنگاہی اپنی | بعد اس کے وہ سب تباہی اپنی

کھولی تھی زبان منہ اندھیرے | کہتے سنتے اُٹھے سویرے

. . . .

. . . .

بولی وہ کہ ہے تو درد لیکن | تم چاہو تو ہے دوا بھی ممکن
وہ بولی جو تو کہے زباں سے | تارے تو اتاروں آسماں سے
چہرے کو چھپا کے زیر چادر | محمود نے کہا کہ مادر
باپ اس کا ہے اندھے پن بجھول | مطلوب بکاؤلی کا ہے پھول
دل داغ اس کا برائے گل ہے | نرگس کے لئے ہوائے گل ہے
ساعی تھی بدل یہ کہنے والی | راہ اس نے سرنگ کی نکالی
دیوؤں سے کہا کہ چوہے بن جاؤ | تا باغ ارم سرنگ پہنچاؤ
سُن حاجتِ نقب بہر گلگشت | کُترا جو ہوں نے دامنِ دشت
پوشیدہ زمیں کے دل میں کی راہ | حد باندھ کے خوش پھرے اُسی راہ
جب مہر تہِ زمیں سمایا | اُس نقب کی رہ وہ آدم آیا
صحنِ چمنِ ارم میں اک جا | بوٹا سا تہِ زمیں سے نکلا
کھڑکا جو نگاہبانوں کا تھا | دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا
گوشے میں کوئی لگا نہ ہوئے | خوشہ کوئی تاکتا نہ ہوئے
گو باغ کے پاسباں غضب تھے | خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے
نرگس کی کھلی نہ آنکھ یکچند | سوسن کی زباں خدا نے کی بند
خوش قد وہ چلا گل و سمن میں | شمشاد رواں ہوا چمن میں

ایوان بکاولی جدھر تھا
حوض آئینہ دار بام و در تھا

رکھتا تھا وہ آب سے سوا تاب
چندے خورشید و چندے مہتاب

پھول اس کا اندھے کی دوا تھا
رشکِ جامِ جہاں نما تھا

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل
پہنچا لبِ حوض سے نہ چنگل

پوشاک اتار اتر کے لایا
پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

گل لیکے بڑھا ایاغ بر کف
چوری سے چلا چراغ بر کف

بارہ دری واں جو سونے کی تھی
سو خواب گہِ بکاؤلی تھی

گول اس کے ستون تھے ساعدِ حور
چلمن مژگاں چشمِ مخمور

دکھلاتا تھا وہ مکانِ جادو
محراب سے در سے چشم و ابرو

پردہ جو حجاب سا اُٹھایا
آرام میں اس پری کو پایا

. . . .

سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی
ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی

یہ پھول انھیں اژدہوں کا ہے من
یہ کالے چراغ کے ہیں دشمن

گل چھن کے ہنسی نہ ہووے بالکل
خندہ نہ ہو برقِ حاصلِ گل

پھر سمجھیں گے ہے جو زندگانی
کچھ نام کو رکھ چلو نشانی

انگشتری اپنی اس سے بدلی
مُہرِ خطِ عاشقی سند لی

آہستہ پھرا وہ سروِ بالا
سایہ بھی نہ اُس پری پہ ڈالا

ہیبت سا زمیں کے دل میں آیا
اندیشے کی طرح سے سمایا

جب نقبِ افق سے مہرِ تاباں
نکلا تو وہ ماہرو شتاباں

گُل ہاتھ میں مثلِ دستِ بیجا ۔۔۔ اِس نقب کی آستیں سے نکلا
وہ دیونی اور وہ دختِ انساں ۔۔۔ دونوں تھیں اُسی کی منتظر واں
گُل لیکے جب آ ملا وہ گلچیں ۔۔۔ اُس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گُل کا جو الم چمن چمن ہے ۔۔۔ یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اُڑایا ۔۔۔ اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغِ خوابِ آرام ۔۔۔ یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غُل سے ۔۔۔ اٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
منھ دھونے جو آنکھ ملتی آئی ۔۔۔ پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے ۔۔۔ کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل ۔۔۔ جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون ۔۔۔ ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے ۔۔۔ بُو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل ۔۔۔ سوسن تو بتا کدھر گیا گُل
سنبل مرا تازیانہ لانا ۔۔۔ شمشاد انھیں سولی پر چڑھانا
ٹھہرائیں خواصیں صورتِ بید ۔۔۔ ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہبازیاں کیں ۔۔۔ سوسن نے زبان درازیاں کیں
پتّا بھی پتے کو جب نہ پایا ۔۔۔ کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لیگیا کون | بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا نہ تھا آنے والا | اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے | جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس | غفلت سے یہ بھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا | پتلی دیِ چشم حوض کا تھا

نام اس کا صبا نہ لیتی تھی ہیں | اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی ہیں

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا | غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

اور خار پڑا نہ تیرا چنگل | مشکیں کس لیں نہ تونے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا | خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے | گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام | تھی سبزے سے رستہ مو براندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد | تھا دم بخود اس کی سنکے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا | جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے | گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی | دست آویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی | انسان کی دست برد جانی

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات | خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات

جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا | وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے | کھال اس کی جو کھنچے سزا ہے

یہ کہہ کے جنون میں غضبناک / خوں روئی، لباس کو کیا چاک

گل سا لہو بھرا گریباں / سبزے کا سا تار تار داماں

دکھلا کے کہا سمن بری کو / اب چین کہاں بکاؤلی کو

تھی بسکہ غبار سے بھری وہ / آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ

کہتی تھی پری کہ اڑ کے جاتی / گلچیں کا کہیں پتا لگاتی

ہر باغ میں بھولتی پھری وہ / ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثل باد جاتی / اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے / پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

پہنچنا تاج الملوک کا ایک اندھے فقیر کے تکیئے پر اور آزمانا گل کا

پھرنا جو وطن کا مدعا ہے / اب صفحے پہ یوں قلم پھرا ہے

وہ گلشن مدعا کا گلچیں / یعنی تاج الملوک حق بیں

جس وقت گل اس چمن سے لایا / محمودا خوش ہوئی کہ آیا

کہنے لگی لو مراد پائی / بولا وہ جو یاں سے ہو رہائی

جب بادیۂ سیاہ شب سے مہتاب / رخصت ہوا جیسے چشم سے خواب

اور گل لئے آفتاب تاباں / ہنگام سحر ہوا شتاباں

وہ مہروش اور وہ ماہ پیکر / اس دیونی پاس آئے مضطر

گل کی وہ غرض جتائی اس کو / رخصت کی طلب سنائی اس کو

کیا کہتی وہ دیونی کہا جاؤ / دیووں سے کہا کہ تخت لے آؤ

دو بال دیئے کہ لو جڑی لاگ — جب وقت پڑے دکھائیو آگ
دیو آن کو سر پر بٹھا کے — پرواز کناں ہوا پہ جا کے
بولے کہ کدھر چلو گے کہدو — فردوس کے رخ کہا اُدھر کو
وہ مُڑ کے اُدھر کو اُڑ کر آئے — گلزار میں بیسوا کے لائے
وقت سحر اور خنک ہوا تھی — گلگشت چمن میں بیسوا تھی
چار آنکھیں ہوئیں تو تھی شناسا — قدموں پہ گری وہ سایہ آسا
صدقے ہو کر کہا خوش آئے — جب گل کی ہوا لگی تھی لائے
ہمراہ یہ کون دوسری ہے — سایہ ہے کہ ہمقدم پری ہے
بولا شہزادہ شکر ہے ہاں — بُر ہے گل آرزو سے داماں
محمودہ نام ہے جو یہ ساتھ — پھول ان کے سبب سے آگیا ہاتھ
جیتا جو پھرا وہ رشک شمشاد — قیدی کیے بیسوا نے آزاد
شہزادے نے بھائیوں کے لے نام — بھجوایا برائے داغ پیغام
جھوٹوں اس نے تھا ان کو تایا — سچوں کھوٹوں نے داغ کھایا
داغا تو تپے تفنگ سے وہ — چھوٹے قید فرنگ سے وہ
چھوڑا ہے بس گئی وہ چمن کو — چاروں داغی پھرے وطن کو
بندوں کو کیا جب اس نے آزاد — آیا لب جو وہ رشک شمشاد
اسباب کشتیوں پہ کر بار — سونپا رب ناخدا کو گھر بار
جب متصل آگیا وطن کے — خیمے یاد آئے مرد و زن کے
سوچا کہ میں خود ہوں خانہ برباد — کیا جائیے کیا پڑے گی افتاد

لازم ہے گل اپنے ہاتھ رکھئے — موقع نہیں بھیڑ ساتھ رکھئے
لنگر کا انھیں کیا اشارہ — خود کشتی سے کر گیا کنارہ
وہ پوربی کرکے جوگیا بھیس — جنگلے کی راہ سے چلا دیس
تکئے یہ فقیر پیر اندھا — اک گوشے میں آنکھیں مانگتا تھا
تھا نقش قدم سا خاک رہ پر — ٹھہرا وہ مسافر اس جگہ پر
بے تجربہ تھی نمائش گل — واجب تھی آزمائش گل
پتلی پہ زر گل آزمایا — سونے کو کسوٹی پر چڑھایا
گل سے ہوئی چشم کور تاباں — ہو جیسے چراغ سے چراغاں
منہ دیکھ کے اس نے دیں دعائیں — پنجے سے خزہ کے لیں بلائیں
گل کے جو اثر سے شادماں تھا — گلچیں وہ ہوا سے ہمعناں تھا

ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھن جانا گل بکاؤلی کا تاج الملوک سے اور بینا ہونا چشم زین الملوک کا

ہے بسکہ یہ چرخ جور پیشہ — یوں خار رہ ستم ہے ریشہ
یہ جا کے اسی جگہ پہ ناگاہ — آپہونچے وہ چاروں غول ہمراہ
کہتے تھے کہ واہ رے مقدر — کس شکل سے پھر کے جاتے ہیں گھر
کیا رنگ فنا نے دکھائے — گل لینے گئے تھے داغ لائے
کس منہ سے پدر کے آگے جائیں — کیونکر بے پھول منہ دکھائیں

ٹھہرائی کہ اور پھول لے جائیں — کحال کو بے وقوف ٹھہرائیں

اک باد ہوائی توڑ کر پھول — کہنے لگے پھول پھول کر غول

کیا بھول ہے کیا اثر ہے اس میں — ہو جاتی ہیں روشن اندھی آنکھیں

وہ کور کہ ہو چکا تھا بینا — دیکھا اُس نے جو یہ قرینا

بولا کہ یہ گل وہ گل نہیں ہے — اس پھول کی اور گل زمیں ہے

وہ جوگی جو جاتے ہیں اگر آئیں — دکھلائیں وہ گل تو آنکھیں کھل جائیں

میں کورا بھی ہو چکا ہوں بینا — اندھا نہیں اب ہوا ہوں بینا

چاروں کو تھی حسرتِ گلِ تر — جو بائی ہوا کی طرح چل کر

اُس جوگی کے جب برابر آئے — باہم کہا دیکھو پھول لائے

گل ہے کہ علاج نور ہے یہ — گل ہے کہ چراغ طور ہے یہ

جوگی یعنی وہ شاہزادہ — بولا کہ بکو نہیں زیادہ

پاتے اگر اس درخت کی چھاؤں — رکھتے ہی نہ تم زمیں پہ پاؤں

ڈینگ آپ کی سب فضول ہے یہ — وہ گل یہ نہیں وہ پھول ہے یہ

یہ کہکے جو جیب سے نکالا — اُن مفت بروں نے ہاتھ ڈالا

قوت میں وہ چار تھے یہ بیکس — شورش میں وہ چار موج یہ خس

غولوں نے بزور پھول اڑایا — اس خضر کو راستا بتایا

گل پانے سے بسکہ سرخرو تھے — گھوڑوں پہ ہوا کے مثل بو تھے

تعجیل سے روبراہ آئے — گل لے کے حضور شاہ آئے

گل لائے جو نور دیدہ دلخواہ — آنکھوں کی طرح پھڑک گیا شاہ

نیچے سے پلک کے پھول اُٹھایا ‏ اندھے نے گل آنکھوں سے لگایا
نور آگیا چشم آرزو میں ‏ آیا پھر آبِ رفتہ جو میں
خورشید بصر گہن سے چھوٹا ‏ خیرات کے در کا قفل ٹوٹا
دولت جو پاس تھی لٹائی ‏ زر بخشا گل کی رونمائی
ایک ایک کو اس قدر دیا زر ‏ محتاج گدا ہوئے تو انگر
بجوائے طرب کے کارخانے ‏ بجوائے خوشی کے شادیانے

پہنچنا بکاؤلی کا دارالخلافت زین الملوک میں اور وزیر ہو کر تاج الملوک کی تلاش میں رہنا

گلچیں کا جو اب پتا ملا ہے ‏ یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے
وہ بادِ چمن چمن خراماں ‏ یعنی وہ بکاؤلی پریشاں
گلشن سے جو خاک اڑاتی آئی ‏ اُس شہر میں آتے آتے آئی
دیکھا تو خوشی کے چہچہے تھے ‏ گلچیں کے شگوفے کھل رہے تھے
گلبانگ زناں تھا جو جہاں تھا ‏ ایک ایک ہزار داستاں تھا
پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی ‏ شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی
جادو سے بنی وہ آدمی زاد ‏ انسانوں میں آملی پریزاد
سلطان کی سواری آرہی تھی ‏ صورت جو نگاہ کی پری تھی
پوچھا کہ اے آدمِ پری رو ‏ انسان ہے پری ہے کون ہے تو؟

کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے؟ ہے کون سا گل چمن کدھر ہے؟
دی اُس نے دعا کہا بصد سوز فرّخ ہوں شہا میں ابنِ فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب، کہا کہ قسمت پوچھا کہ طلب، کہا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ لایا بصد امتیاز ہمراہ
چہرے سے امیرزادہ پایا گھر لا کے وزیر اُسے بنایا
نذریں لیئے بندگانِ درگاہ دستور سے آ ملے بصد جاہ
دربار میں چاروں شاہزادے دیکھے تو کھلے وہ دل کے سادے
چاہا گلچیں کا امتحاں لے پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے
بتلانے لگے وہ چاروں ناداں کوئی یمن اور کوئی بدخشاں
جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے خاتم کے نگیں بنائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحبِ فکر آیا تاج الملوک کا ذکر
ظاہر نہ کیا بطون اپنا طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہِ رہرواں بنا کے شام و سحر اس میں آپ آ کے
رہرو کو دیا بلطف و اکرام آتے آرام جاتے انعام

آباد ہونا تاج الملوک کا گلشن نگارین بنوا کے اور شہرہ ہونا

تعمیر مکاں کے ہیں جو آثار یوں خامہ ہے بہر بیت معمار

شہزادہ کہ عازم وطن تھا
گُل پانے سے خوش چمن چمن تھا

اندھے کو کیا جب اس نے بینا
اور دائیوں نے وہ پھول چھینا

سوچا کہ خوشی خدا کی غم کھاؤ
حمّالہ دیونی کو بلواؤ

نقل ارم اک مکاں بنا کے
رکھو پریوں کو اپنے لا کے

بال آگ پہ رکھتے آندھی آئی
وہ دیونی بال باندھی آئی

تنہا اُسے دیکھ کر کہا "ہیں!
محمودا کیا ہوئیں کہا ہیں؟

دریا پہ ہوں ان کو چھوڑ آیا
مسکن کے لئے تمھیں بلایا

لیکن وہ مکاں وہ حوض وہ باغ
جو باغ بکاولی کو دے داغ

حمّالہ نے دیووں کو کیا یاد
آئے تو کہا "یہ بن ہو آباد

ویرانے کو گل زمیں بناؤ
گلزار جواہریں بناؤ

صنّاع طلسم کار تھے وہ
گلشن کے لئے بہار تھے وہ

دیووں نے اُدھر محل بنایا
کشتی سے وہ دخت رز کو لایا

حمّالہ اس کی مادر پیر
محمودا سے ہوئی بغلگیر

کچھ دیووں کو چھوڑ کر وہیں پر
رخصت ہو کر چلی گئی گھر

گلشن میں سمن بروں کو لایا
نسریں بدنوں سے گھر بسایا

دیووں کو کہا کہ بہر تمکین
آباد ہو گلشن نگاریں

دیو آدمی بن کے بن میں آئے
آتے جاتے کو گھیر لائے

جو سن کے خبر گیا اُدھر کو
جنت سے وہ پھر پھرا نہ گھر کو

البسکہ قریب شہر تھا باغ
خورشید افق نظر پڑا باغ

مفلس ، زردار ، امیر ، قلاش
نوکر ، تاجر ، فقیر خوش باش
گھر چھوڑ کے چل بسے سب انساں
پھر تن میں نہ آئے صورتِ جاں

ملاقات ٹھہرے نے زین الملوک اور تاج الملوک کی آپس میں

گلشن جو بنا جواہر آئیں
یوں صفحۂ قلم سے ہے نگاریں
ساعد نام ایک مہ لقا تھا
دلبر کا غلام باوفا تھا
صحرا سے جو سیر کرکے آیا
لکڑی کے اُچکا کے بوجھ لایا
دلوائے ہر ایک کو پئے قوت
الماس و عقیق و لعل و یاقوت
تھی لبکہ وہ جا خلاصۂ دہر
کچھ ٹھہرے کچھ آئے جانب شہر
کف میں وہ جو لعل بے بہا تھے
من پاتے ہی لوگ اژدہا تھے
شحنے نے سنا پکڑ بلایا
لے کر اظہار ساتھ آیا
دیکھا تو وہ جلوہ گاہ امید
اک دائرہ تھا برنگ خورشید
دروازے پہ دیووں کا تھا پہرا
بھجواکے خبر وہ شحنہ ٹھہرا
جب وہاں سے طلب ہوا تو درباں
لائے اُسے پیش گاہ سلطاں
آداب کیا ادب سے ٹھہرا
ہیبت زدہ دور سب سے ٹھہرا
اُن لوگوں کو لے گیا تھا ہمراہ
معروض کیا کہ یا شہنشاہ
کم مایہ یہ لوگ ہیں بظاہر
چوری کے تو یہ نہیں جواہر
ساعد نے کہا کہ ہے یہ حاسد
نیت ہوئی ہوگی اس کی فاسد
حضرت یہ وہی تو ہیں تبردار
جا ان سے نہ بولیو خبردار

پھر کر انھیں یاؤں شحنہ بے آس
آیا زین الملوک کے پاس
کی عرض کہ باغ اک بنا ہے
یہ شہر اُجڑا ہے وہ لبا ہے
جو کوئی ہے اس جگہ پہ جاتا
ڈھیروں ہے جواہرات پاتا
حضرت نے کہا کہ بک نہ خیرہ
قاروں کا وہیں ہے کیا ذخیرہ
فرخ کہ وزیر باخرد تھا
سلطان کا مشیر نیک و بد تھا
بولا کہ شہا یہ بات کیا ہے
نیرنگ و فسوں کا گھر بڑا ہے
ہر چند کہ طرفہ حال ہے یہ
کچھ دور نہیں مثال ہے یہ

حکایت ایک عورت کے مرد بن جانے کی دیو کے جادو سے

اک ملک میں ایک صاحب فوج
رکھتا تھا محل میں بار و رز دج
تھا داغ لپسر مقدر اُس کو
جنتی تھی ہمیشہ دختر اُس کو
از بسکہ وہ شاہ تھا بد اختر
کرتا تھا حسد سے قتل دختر
اک بار محل میں پھر حمل تھا
وہ شاہ کہ ظلم میں مثل تھا
کھا بیٹھا قسم کہ اب کی باری
بیٹا جو نہ دے جناب باری
اقبال کا کچھ نہ جانئے اوج
کر ڈالئے ذبح دختر و زوج
کنبا تھی غرضکہ راس اُسکی
پوری نہ ہوئی وہ آس اُسکی
سلطان کا جو عہد بے خلل تھا
گھر والوں کو خوف کا محل تھا
ملحوظ بدل تھا پردۂ راز
سیارہ شناسوں سے کیا ساز
ہر چند ستارہ ماں کا تھا ماند
تھی چاندنی شہرہ کر دیا چاند

پھر اہلِ نجوم محرمِ راز — با نوئے فلک سے ہو کے دمساز
بیٹھے گا وہ زائچہ بنا کے — گویا ہوئے دست بستہ آ کے
حضرت یہ پسر ہے نیک اختر — بدبین مگر ہے ایک اختر
جب تک نہ چلے یہ اپنے پاؤں — حضرت نہ پسر کے سامنے ہوں
حیلہ کر کے چھپا کے یکچند — بیتاب ہوا جب آرزومند
وہ گندم جو نما تھی بالی — مردانہ لباس سے نکالی
خوش ہو کے پدر نے ہر شادی — ٹھہرائی کہیں کی شاہزادی
بن ٹھن کے عروس شکل داماد — شادی کو چلی بجانِ ناشاد
اک شب کسی دشت میں تھے ڈیرے — اور روزِ نکاح تھا سویرے
خیمے سے وہ بیقرار نکلی — اُس چھالے سے مثلِ خار نکلی
دیکھا تو اندھیری رات سنسان — اک عالمِ ہو ہے اور بیابان
اک دیو وہاں پہ گشت میں تھا — جو پائے شکار دشت میں تھا
دیکھا تو کہا خضر ملے آؤ — منہ کھولو عدم کی راہ بتلاؤ
بولا وہ کہ سُن تو آدمی زاد — کیوں تنگ ہے جی سے کیا ہی بیداد
اے مردِ خدا، خدا کی سوگند — کہہ جس لیے ہو تو آرزومند

.... — ....

.... — ....

خاطر تری لے طلسم دکھلاؤں — تو مجھ سی ہے میں تجھ سا بن جاؤں
موند آنکھ کہا، تو موند لی آنکھ — کھول آنکھ کہا، تو کھول دی آنکھ

اب یاں سے ہے قصہ مختصر طول
فرخ کہ وہ تھا وزیر معقول
بولا کہ شہا جو یہ ہوا ہے
اس بات کا بھروجو دکیا ہے
شہ نے کہا سن وزیر دانا
بے دیکھے سُنے کو کس نے مانا
یاد آئی مجھے بھی اک روایت
یہ کہنے بیان کی حکایت

حکایت نصیحت گری مرغ اسیر اور نافہمی صیاد کی

اک مرغ ہوا اسیر صیاد
دانا تھا وہ طائر چمن زاد
بولا جب اس نے باندھے بازو
کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں
پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے مرے دام
بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ
سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ
سن کوئی ہزار کچھ سنائے
کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے
قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت
عاجز ہو تو ہارئے نہ ہمت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
طائر کے یہ سُن کلام صیاد
بن داموں ہوا غلام صیاد
بازو کے جو بند کھول ڈالے
طائر نے تڑپ کے پر نکالے
اک شاخ پہ جا چہک کے بولا
کیوں پر مرا گیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری مجھے اڑایا
غفلت نے تری مجھے چھڑایا

دولت نہ نصیب میں تھی تیرے — تھا لعل نہاں شکم میں میرے
دیکر صیاد نے دلاسا — چاہا پھر کچھ لگائے لاسا
بولا کیا دیکھ کر کیا جعل — طائر کبھی کہیں نگلتے ہیں لعل
ارباب غرض کی بات سنکر — کر لیجئے یک بیک نہ باور
فرخ یہ وہی مثل نہ ہووے — دیکھ آ جو تجھے دہل نہ ہووے
مشتاق تو تھا چلا وہ دستور — دکھلائی دیا وہ بقعۂ نور
نقشے میں وہ گلشن نگاریں — گلزار ارم سے تھا خوش آئیں
حیرت تھی کہ یہ طلسم کیا ہے — پردیس میں ہوں کہ گھر مرا ہے
اس سوچ میں تختگہ تک آیا — حیران وہ وزیر شہ تک آیا
آداب اک کر کے حسب دستور — ٹھہرا تو وہ پادشاہ مستور
سمجھا کہ حسین آدمی ہے — کیا جانے کہ خود بکاؤلی ہے
پوچھا کہ کدھر سے آ کے کیا نام — بولا وہ کہ نام سے ہے کیا کام
انسان ہوں بندۂ خدا ہوں — بھیجا زین الملوک کا ہوں
گستاخی معاف آپ آئے — بن گھیر لیا مکاں بنائے
بہکا کے بسائے مردم شہر — حضرت کا بڑا ہے آپ پر قہر
دعوی یہ ہے یاں زمین دابی — آیا وہیں آئی ہے خرابی
خیر اب بھی رفع شر جو چاہو — سر آنکھوں سے چل کے جبہ سا ہو
بولا وہ کہ فتنہ گر نہیں ہم — شر جن سے ہو وہ بشر نہیں ہم
درویشی میں دل کے بادشاہیں — مسند کے تکیے پر گدا ہیں

دستور کہ عرض کر چکا تھا / مثلِ دلِ بدگماں رُکا تھا
بولا چلو صلح درمیاں ہو / باہم مہ و مہر کا قِراں ہو
بولا وہ فقیر کی بلا جائے / مشتاق جو ہو وہ شوق سے آئے
بولا وہ کہ خیر تا بفردا / اُٹھ جائے گا درمیاں سے پردا
یہ کہکے پھرا وزیر آیا / پہنچا تو وہ شہر خالی پایا
شہزادہ وشہ محل میں تھے واں / برہم زدہ بزم کے چراغاں
شہ نے جو وزیر آتے دیکھا / فرخ فرخ پکار اُٹھا
سلطاں کے نثار ہوکے دستور / بولا کہ بلائے شاہ ہو دور
دیکھ آیا میں وہ مکانِ یاقوت / ہے معدنِ لعل و کانِ یاقوت
تختہ ہے زمردیں کہ مینو / گلشن ہے جواہریں کہ جادو
نقشہ کہوں کیا نگار خانہ / جادو کا تمام کارخانہ
دیوؤں کی بنائی ہے وہ بنیاد / رہنے والے ہیں آدمی زاد
واں صاحبِ تاج وتخت جو ہے / درویش ہے شاہ نام کو ہے
دیو اس کے عمل میں آ گئے ہیں / جادو کے محل بنا گئے ہیں
کل آپ بھی چل کے کیجئے سیر / وعدہ کر آیا ہوں کہا خیر

بھید کھلنا چھپے ہوؤں کا ایک ایک پر

اب خامے سے واشگاف یوں ہے / دل ملنے کی راہ صاف یوں ہے
فرخ جو گیا تو شاہزادہ / سوچا کہ ہوں ٹھاٹھ کل زیادہ

رکھا آتش پہ دوسرا بال ۔ حاضر ہوئی دیونی قوی حال
دعوت کی اُسے خبر سنائی ۔ دیووں کے رُخ اس نے آنکھ اٹھائی
ہمچشموں نے چتون اُسکی تاڑی ۔ پلکوں سے زمین بن کی جھاڑی
غولوں سے جو تھا بھرا بیابان ۔ پھولوں سے بنا دیا خیابان
صناعی کی انھوں نے رات بھر کی ۔ مشتاق نے واں وہ شب بسر کی
بجتے ہی گجر وہ شاہ ذیجاہ ۔ چاروں شہزادے لیکے ہمراہ
جو جو اُمرا تھے سب بلا کے ۔ فرخ کو خواصی میں بٹھا کے
مشرق سے رواں ہوا دلاور ۔ جس طرح افق سے شاہ خاور
بجلی سے جو زرق برق آئے ۔ فرش ابر کی طرح بچھتے پائے
دیکھا تو تمام دشت گلزار ۔ دائیں بائیں دو رستہ بازار
شہ کہتا تھا دشت پُر خسک تھا ۔ فرخ کہتا تھا کل تلک تھا
غافل تھے کہ سبز باغ ہے یہ ۔ اپنے ہی جگر کا داغ ہے یہ
تجویز رہے تھے سب کے سب دنگ ۔ جادو، افسوں، طلسم، نیرنگ
اتنے میں سنا کہ صاحب تاج ۔ جتنا بڑھے پیچھے سب ہو تاراج
کیا لشکری اور کیا شہنشاہ ۔ سناٹے میں تھے کہ اللہ اللہ
دیکھے جو جواہرات کے ڈھیر ۔ سب من کی ہوس سے ہو گئے سیر
شہزادے نے آمد ان کی پائی ۔ کی تا درِ خانہ پیشوائی
دونوں میں ہوئیں جو چار آنکھیں ۔ دولت کی کھلیں ہزار آنکھیں
ایوان جواہریں میں آئے ۔ الماس کے شہ نشیں میں آئے

وہ چتر کے زیر سایہ بیٹھے | افسر سب پایہ پایہ بیٹھے
جو جو کہ تواضعات ہیں عام | لے آئے خواص نازک اندام
چکنی ڈلی، عطر، الائچی، پان | نقل و مے و جام و خوانِ الوان
رغبت سے انہیں کھلا پلا کے | بولا شہزادہ مسکرا کے
اس تاج شہی میں کے نگیں ہیں | کے نام و نشان دل نشیں ہیں
سلطان نے کہا بصد لطافت | یہ چار ہیں عنصر خلافت
اک اور ہوا تھا قابلِ چشم | وہ نور بصر تھا دشمنِ چشم
جب لائے یہ گل بکاؤلی کا | نکلا تب خار روشنی کا
پوچھا اس نے وہ اب کدھر ہے | سلطان نے کہا کہ کیا خبر ہے
پوچھا شہزادے نے کہ یا شاہ | صورت سے ہے اس کے کوئی آگاہ
اک ان میں سے چشم آشنا تھا | کوکا اسی شاہزادے کا تھا
بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں | دیکھا تو کہا مری نظر میں
صورت وہی رنگ رو وہی ہے | لہجہ وہی گفتگو وہی ہے
یہ سنتے ہی اس نے خندہ کر کے | سر پاؤں پہ رکھ دیا پدر کے
سر قدموں سے شاہ نے اٹھایا | فرزند کو چھاتی سے لگایا
لے لے کے بلائیں کاکلوں کی | پیشانی چومی پیٹھ ٹھونکی
عرض اس نے کیا کہ دو پرستار | پابوسی شہ کی ہیں طلبگار
حضرت نے کہا بلائیے خیر | اٹھ جائیں جو بیٹھے ہوں یہاں غیر
شہزادے نے اک مکاں بتایا | ایک ایک اٹھا ادھر کو آیا

سب اٹھ گئے پر وہ چاروں باغی — بیٹھے رہے فرش گل پہ داغی
شہزادہ اٹھا محل میں آیا — پردے تلک اُن کو ساتھ لایا
دلبر سے کہا میں جب کہوں آؤ — تو کہیو یہ چاروں داغی اٹھواؤ
در پردہ وہ سکھا کے باہر آیا — بے پردہ حضور شہ بلایا
دلبر نے کہا نہ جاؤں گی میں — قربان گئی نہ آؤں گی میں
اٹھ جائیں یہ چاروں سست بنیاد — داغی ہوئے ہیں غلام آزاد
چاروں کا یہ سنتے ہی اڑا رنگ — یکبارگی شاہ ہو گیا دنگ
دکھلائی دئے جو بیٹے بے رخ — دیکھا تاج الملوک کے رخ
وہ جعل وہ ہار وہ غلامی — وہ گھات وہ جیتنا تمامی
وہ دسترس اور وہ پامردی — وہ بیکسی اور وہ دشت گردی
وہ دیو کی بھوک اور وہ تقریر — وہ حلوے کی چاٹ اور وہ تحریر
وہ سعی وہ دیونی کی صحبت — محمودا کی وہ آدمیت
تجویز کے وہ سرنگ کی راہ — اور موش دوانیاں وہ دلخواہ
وہ سیر چمن وہ پھول لینا — وہ عزم وطن وہ داغ دینا
وہ گور کے حق میں خضر ہونا — وہ غولوں سے ملکے پھول کھونا
وہ بال کو آگ کا دکھانا — وعدے پہ وہ دیونی کا آنا
وہ نزہت گلشن نگاریں — وہ دعوت بادشہ وہ تمکیں
گزرا تھا جو کچھ بیاں کیا سب — پنہاں تھا جو کچھ عیاں کیا سب
پہلے تو بہت وہ منہ چڑھے ڈھیٹ — آخر داغی دکھا گئے پیٹ

اٹھوا کے انھیں وہ دو خوش آئیں — پابوسی شہ کو سر سے آئیں
حضرت نے سمجھ کے حسن خدمت — دونوں کو دئے خطاب و خلعت
نذریں ان دونوں نے دکھائیں — رخصت ہو کر محل میں آئیں
مسند سے شہ اٹھ کے بے محابا — بولا بیٹے سے جانِ بابا
روشن کیا دیدۂ پدر کو — مادر کے بھی چل کے آنسو پوچھو
مشتاق کو رو براہ پایا — ہمراہ اسے تا بخانہ لایا
ماں نے دیکھا جو وہ دلاور — اشکوں کے گہر کئے نچھاور
وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر — مانند سرشکِ چشم مادر
ہر خویش و یگانہ سے ملا وہ — پھر اپنی جگہ پہ آگیا وہ

غائب ہو جانا فرخ یعنی بکاؤلی کا اور بلوانا تاج الملوک کو گلشن نگارین سے اور متفق ہو کر گلزار ارم میں رہنا

کھلنے پہ جو ہے طلسم تقدیر — اب خامے نے یوں کیا ہی تحریر
فرخ اور بادشاہ کا دستور — یعنی وہ بکاؤلی مستور
مطلوب کا حسن سمجھ کے سب حال — چاہی کہ نکالے کچھ پر و بال
سوچی کہ دلا شتاب کیا ہے — پھر سمجھیں گے اضطراب کیا ہے
اس وضع کا پاس کر گئی وہ — تغییرِ لباس کر گئی وہ
فرخ کہنے تک آدمی تھی — پھر وہ ہی بکاؤلی پری تھی

غربت سے چلی، وطن میں آئی
صحرا سے اُڑی، چمن میں آئی

پژمردہ خواصوں میں پڑی جان
صدقے ہوئی کوئی، کوئی قربان

اُس غنچہ میں اک سمن پری تھی
وہ ہمنفس بکاؤلی تھی

بولی کہو کیا کیا، کہا خوب
بے کچھ کہے پھر بھی آئے کیا خوب

مانگا کاغذ دوات خامہ
لکھا گلچیں کے نام نامہ

اے یوسفِ چشم زخم یعقوب
اے رشکِ برادرانِ منکوب

اے دلبرِ دلبرِ دغا باز
اے دیو سوار عرش پرواز

اے آبِ تہ زمینِ نیرنگ
اے نقب دوانِ باغ گلرنگ

اے پردہ کشائے بے حجابی
اے دزد حنائے دستیابی

اے رہبرِ رہروِ رہ نہادہ
اے صرصرِ گل بباد دادہ

اے سرو برگ گلشن آرا
اے لعل نمائے سنگ خارا

اے بے خبرِ طلسم صورت
اے بے بصرِ ترخ ضرورت

اے باعثِ عزم میزبانی
اے صاحبِ بزم مہربانی

اے آئینہ دار خود نمائی
اے سرمۂ چشم آشنائی

اے پردہ کشائے روئے پنہاں
اے داغ نمائے پشت خواں

تو باغِ ارم سے لے گیا گل
تو مجھ سی پری کو دے گیا جل

بے رُخ ترے واسطے ہوئی ہیں
فرخ ترے واسطے ہوئی ہیں

تجھ کو ترے باپ سے ملایا
مجھ کو یہ ملا کر تجھ کو پایا

جو جو اسرار تھے نہانی
سب تجھ سے سنے تری زبانی

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے — جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
چاہا تھا کردں سرے سے پامال — کر شکر سمجھ کہ تھا خوش اقبال
کیا کہیے کہ صورت اور کچھ تھی — وقت اور ضرورت اور کچھ تھی
اب تک ہیں وہ خارجی کے جی میں — جلد آکہ ہے مصلحت اسی میں
آئے گا تو درگزر کروں گی — ورنہ میں بہت سا شر کروں گی
داغوں پہ دئے ہیں داغ تونے — دکھلائے ہیں سبز باغ تونے
کانٹوں میں اگر نہ ہو الجھنا — تھوڑا لکھا بہت سمجھنا
پھر خط کی نہ ہو امیدواری — القصہ ہے قلم کی دوستداری
یہ لکھ کے کہا سمن پری کو — چالاک ہے تو ہی قاصدی کو
یہ خط یہ انگوٹھی لے ابھی جا — پورب کے سمت کو چلی جا
رستے میں ہے گلشن نگاریں — رہتا ہے وہیں مرا وہ گلچیں
خاتم کی نشاں سے نامہ دیجو — ٹھہری رہیو جواب لیجو
خط خاتم لے کے وہ ہوائی — پتا ہوئی اور پتے پہ آئی
وہ باغ کہ تھا جواہر آگیں — ثابت ہوا گلشن نگاریں
وہ آدم جو روش پری رو — یعنی تاج الملوک خوشخو
گلگشت میں تھا کسی روش پر — محو دائیں بائیں دلبر
قاصد نے جو رخ پری دکھایا — دھیان اس کو بکاؤلی کا آیا
پہچانتے ہی نگیں خاتم — بے شبہ ہوا یقیں کا عالم
پرتو پہ وہ یوں چلا تڑپ کے — انگارے پہ جیسے کباب پھکے

دھوکا تھا فقط بکاؤلی کا — قاصد نے دیا وہ خط پری کا
گو سرمۂ خموشی نے کھلایا — تحریر کو آنکھوں سے لگایا
قاصد سے کلام لطف بولا — خط صورت چشم شوق کھولا
وہ نامہ کہ عنبریں رقم تھا — قسمت کا نوشتہ یک قلم تھا
تحریر تھی سرگذشت ساری — کچھ یاس تھی کچھ امیدواری
منگوا کے وہیں دوات و خامہ — تحریر کیا جواب نامہ
اے شاہ ارم کی دخت گلفام — فرخ لقب و بکاؤلی نام
اس نام کے اس لقب کے صدقے — اس نامے کے اس طلب کے صدقے
میں نے جو غرض سے جی چرایا — تو نے کیوں آ کے منہ چھپایا
میری جو بدی ہوئی تھی کچھ یوں — تو نیک تھی بے ملے گئی کیوں
تو جائے اور کیوں نہ آئے افسوس — افسوس افسوس ہائے افسوس
تقدیر پھری پھری نہیں تو — اُمید گئی ہا گئی نہیں تو
اے کاش میں کچھ بھی سانس پاتا — جی کھول کے داغ دل دکھاتا
معلوم تو ہے کہ شوق کیا تھا — جو کھینچ کے یہاں سے لے گیا تھا
اب مجھ میں وہ دم اجی کہاں ہے — وہ دل، وہ جگر، وہ جی کہاں ہے
مر جاؤں اگر طلب میں تیری — ہیں کیا کہ خبر نہ پہنچے میری
قابل وہاں آنے کے کہاں ہوں — یہاں بھی جو رہا تو نیم جاں ہوں
مجھ سے مری خاطر اب کہاں جمع — تو بستر شعلہ میں رگ شمع
تو برق دماں میں خرمن خار — تو سیل رواں میں خستہ دیوار

تو جوششِ یم ہیں مور بے پر
میں نقشِ قدم، تو بادِ صرصر

دھڑکا ہے یہی تو جان دوں گا
مرجاؤں گا اب نہ میں جیوں گا

ہو تجھ سی پری جو خصم جانی
انساں کی ہے مرگ زندگانی

منظور جو ہو حیات میری
تو مان لے ایک بات میری

حمّالہ کو بھیج آکے لیجائے
شاید مجھے زندہ پاکے پہنچائے

بھیجا نہ اُسے تو جان لینا
آسان ہے یہاں بھی جان دینا

یہ لکھ کے جو خط سے ہاتھ اٹھایا
قاصد نے لیا جواب لایا

مطلوب کا خط وہ پڑھ رہی تھی
دیکھا تو وہ دیونی کھڑی تھی

پوچھا کہ ارے تجھے خبر ہے
گلچیں مرا کون سا بشر ہے

وہ صدقے ہوئی کہا بلا لوں
بے نتھے کسی کا نام کیا لوں

یہ سُن کے وہ شعلہ ہو بھبوکا
بولی کہ تجھے لگاؤں لوکا

تیرا ہی تو ہے فساد مُردار
داماد کو گل دیا، مجھے خار

گل نقب کی راہ لے گیا چور
زندہ کروں اس موئے کو در گور

حمّالہ جلی ہوں کیا کہوں میں
داماد کو لا تو ٹھنڈی ہوں میں

آگاہی جو دیونی نے پائی
بگڑی ہوئی بات یوں بنائی

محمودہ ہے اک کنیز زادی
انساں سے ہوئی ہے اس کی شادی

میرا تو نہیں قصور ہے کچھ
شاید اُس کا فتور ہے کچھ

مجرم جو وہ ہے تو لو میں لائی
یہ کہکے اُٹھی جلی ہوائی

آئی تو یہ زار نیم جاں تھا
آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا

حمالہ کو دیکھتے ہی رو رو
پوچھا کہ تو لینے آئی مجھ کو

بولی وہ بہنے بگاڑ کیا ہے
چل دیکھ تو جھڑ جھاڑ کیا ہے

کچھ بول کے زیرِ لب وہ دل زار
ہیجان میں تپ کے جیسے بیمار

لرزا سا چڑھا جو دیونی پر
مانند حواس اُڑی وہ مضطر

اُس سمت سے پہنچی یہ عقیلہ
واں آئی پری کی ماں جمیلہ

شکوہ کرنے لگی پری سے
یوں کہنے لگی بکاؤلی سے

گلزار کی سیر خوب بھائی
برسوں سے نہیں تو گھر کبھی آئی

بے طرح گلوں کی ہے تو شیدا
گلچیں نہ ہوا ہو کوئی پیدا

کھلتے ہیں کچھ انتظار کے طور
رخ میری طرف نظر کہیں اور

مادر کے کلام سن کے دختر
بولی کہ چمن تو ہے مرا گھر

میں کیا جانوں، مجھے خبر کیا
رُخ کس کو کہتے ہیں، نظر کیا؟

تقریر جو بھولے پن کی پائی
وہ سادہ دل اُٹھ کے گھر کو آئی

جب اُٹھ گئی یہ تو دیونی وہ
حاضر ہوئی لے کے آدمی وہ

آیا تو وہ منتظر تھی خونخوار
اندیشہ سے کانپ اٹھا گنہ گار

واں غصہ بھری غضب وہ چتون
پلکوں سے یہاں نظر پہ چلمن

واں سرمۂ چشم گرم تسخیر
یاں قطرۂ اشک تر گلوگیر

واں پھانسنے کو بلا وہ گیسو
یاں تابِ سخن نہیں سرِ مو

بولی وہ پری بصد تأمل
کیوں جی تمھیں لے گئے تھے وہ گل

کیا کہتی ہوں میں ادھر تو! دیکھو!
میری طرف اک نظر تو دیکھو!

ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری
فرما ہیے کیا سزا تمہاری

قابو میں پری کے تھا سلیماں
بولے بتلائیے کیا پشیماں

کی عرض رضا ہے جو خوشی ہو
عاشق کی سزا جو پوچھتی ہو

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ
کالے ناگوں سے مجھ کو ڈسواؤ

تلوار سے قتل ہو جو منظور
ابرو کے اشارے سے کرو چور

زنداں میں جو زندہ بھیجنا ہو
اپنے دل تنگ میں جگہ دو

یہ سُن کے وہ شوخ مسکرا کے
بولی اُسے چھاتی سے لگا کے

گلچیں تو فقط نہیں چمن کا
محرم ہے سارے تن بدن کا

رُخ دیکھ چکی ہوں اب ترا میں
منہ دوسرے کو دکھاؤں کیا میں

افشائے راز ہو کر پھنسنا تاج الملوک کا طلسم میں اور مقید رہنا بکاؤلی کا

از بسکہ یہ عشق فتنہ پرداز
ہے شمع فروزِ پردۂ راز

ہمدم جو بکاؤلی نے پایا
غمّاز یہ غم خوشی میں لایا

بھڑ کائی جمیلہ مادر اُس کی
گزرانی خبر برابر اُس کی

اک شب کہ تھی خالِ روئے شامت
یا مردمِ دیدۂ قیامت

وہ شعلۂ آتشیں لپک کے
بجلی سی گری چمک دمک کے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں — کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں
شہزادہ پہ اس نے مارا چنگال — دریائے طلسم میں دیا ڈال
بیٹی کی طرف کیا نظارہ — جھلا کے کہا کہ خام پارہ
حرمت میں لگایا داغ تو نے — لٹوائی بہارِ باغ تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے — چل دور ہو میرے سامنے سے
خجلت سے پری زمیں میں گڑ کے — سایہ سے رہی قدم پکڑ کے
مادر نے ہزار پاسباں میں — رکھا اسے قید کے مکاں میں

پابزنجیر ہونا بکاولی کا سودائے فراق تاج الملوک میں

سودائے الم ہے اب جو تحریر — حرفوں سے قلم ہے پا بزنجیر
سنسان وہ دم بخود تھی رہتی — کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں — آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ — کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
پچھنہ جو گزرے بے خور و خواب — زائل ہوئی اس کی طاقت و تاب
صورت میں خیال وہ گئی وہ — ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے اٹھتے بیٹھتے چکر — فانوس خیال بن گیا گھر
پریاں جو اس کی پاسباں تھیں — دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں
سمجھانے لگیں کہ مرتی ہے کیوں — ترکِ خور و خواب کرتی ہے کیوں
ثابت کچھ اثر ستارے کا ہے — اس چاند کو کیا گہن لگا ہے

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر
منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر

صورت تری زار ہو گئی ہے
گل ہو کے تو خار ہو گئی ہے

ہے ہے تری عقل کس نے کھوئی
ناجنس کو چاہتا ہے کوئی

سہتی نہیں آگ ماہئی تر
رہتا نہیں پانی میں سمندر

مذکور نہیں ہے کچھ حسد کا
ساتھی نہیں کوئی کارِ بد کا

روشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر
پھر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر

محبوس کیا ہے تجھ کو ہر چند
توبہ کا تو در نہیں کیا بند

بھولے سے بھی کر نہ یادِ آدم
پھر گھر وہی تو وہی وہی ہم

اے شمع نہ سوچی گر بد و نیک
رشتہ کاٹے گا تجھ سے ہر ایک

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار
اب مان نہ مان تو ہے مختار

تو قید جفا میں ہے کہ ہم ہیں
تو دامِ بلا میں ہے کہ ہم ہیں

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

جھنجلائی بکاؤلی کہ بس بس
اب ایک کہو گی تم تو میں دس

رنجور جو ہوں تو میں تمھیں کیا
مجبور جو ہوں تو میں تمھیں کیا

مانا مری حالت اب ردی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

بلبل اُسی رشکِ گل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں

سوجیں وہ کہ یہ نہیں سمجھتی
ہے بالکہ برنگِ زلف اُلجھتی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجئے
سایہ ہو تو دور دھوپ کیجئے

کچھ روگ جو درپے خلش ہو
درماں کے لئے دوا دوش ہو

بیمارِ عشق لا دوا ہے ۔۔۔ اس باغ کی اور ہی ہوا ہے
آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ ۔۔۔ ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ
یاد آئیں جو ابروان خمدار ۔۔۔ رہتے نہ کہیں گلے پہ تلوار
وہ سبزہ خط جو یاد آئے ۔۔۔ جھنجلا کے کہیں نہ زہر کھائے
کر یاد کہیں چہ ذقن کو ۔۔۔ کودے نہ کنوئیں میں باؤلی ہو
دیوانے کی مطلق العنانی ۔۔۔ ہے باعثِ مرگ ناگہانی
تدبیر کا حوصلہ نکالا ۔۔۔ زنجیر کا سلسلہ نکالا
بیڑی تھی رُخِ جنوں کی کاکل ۔۔۔ پابوسیٔ گل کو آیا سنبل
جب وحشتِ عشق ہو زیادہ ۔۔۔ زنجیر ہو پیش پا فتادہ
شوریدہ بکاؤلی غضب تھی ۔۔۔ زنجیروں میں بھی وہ بند کب تھی
بڑھتی جب دل کی بیقراری ۔۔۔ پڑھتی یہ غزل بآہ و زاری

غزل

عالم کا ترے جہاں بیاں ہے ۔۔۔ بیتابیٔ دل جہاں جہاں ہے
زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو ۔۔۔ دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے
ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ ۔۔۔ قائم جو زمین و آسماں ہے
جو داغ کہ مہر ہے فلک پر ۔۔۔ دل میں مرے اب تلک نہاں ہے
کس سوچ میں ہو نسیم بولو ۔۔۔ آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

آنا تاج الملوک کا سحرائے طلسم سے روح افزا پری کے ساتھ فردوس میں

بہرِ طلسم اختراعی ۔۔۔ ہے بحرِ سخن میں خامہ غواص

وہ قطرۂ بارشِ جدائی — وہ غرقۂ بحرِ آشنائی
وہ بادشہِ حباب افسر — یعنی تاج الملوک مضطر
بے مہریِ چرخ سے جو ناگاہ — گرداب کے ہالے کا ہوا ماہ
جو ماہ سپہر برتری تھا — سو ماہیِ بحرِ ابتری تھا
بادل سا وہ بحرِ آسماں جوش — بجلی سی لہر سے تھا ہم آغوش
دریا تھا نہ بحر تھا نہ جیحوں — طوفانِ طلسم جوشِ افسوں
گرتے تو وہ پانی سر سے گذرا — اُبھرا تو نہ کچھ نظر سے گذرا
موجوں کی عوض تھی چینِ داماں — گرداب کے بدلے تھا گریباں
آگے جو بڑھا جزیرہ دیکھا — اشجار کا واں ذخیرہ دیکھا
جس پھل کو چھوا جو پھر کیا غور — ہاتھ آیا نہ کچھ حباب کے طور
جانا کہ طلسم کا ہے جنگل — ہے یاں کے درخت کا یہی پھل
اور آگے بڑھا وہ بحرِ اوہام — ڈوبا خورشید ہو گئی شام
ڈر جانوروں کا جی میں بیٹھا — اک نخل کہن پر چڑھ کے بیٹھا
ناگاہ سنی صدائے پُر خوف — آیا اک اژدہا پئے طوف
صورت میں پہاڑ کی نشانی — سیرت میں بلائے ناگہانی
منہ کھول کے سانپ اک نکالا — اُس کالے نے منہ میں پیہ ڈالا
لہرا کے ادس چاٹی — بن میں کالوں نے رات کاٹی
جب صبح ہوئی تو منہ میں ڈالا — کالے نے من اژدھے نے کالا
وہ جا کے افق میں مہر چمکا — من افعیِ شب کے منہ سے نکلا

سوچا وہ کہ لیجے من کسی طور
کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں
دودھ اُن کا دوہا پیا کہا لو
نکلا جو پھر آکے شب کو اژدر
گوبر پھینکا تو دب گیا من
بے روشنی اندھے ہو گئے وہ
من لے کے جو اُس نے مُہرہ مارا
دو مرغ تھے بیٹھے اک شجر پہ
میں تجربہ کر چکی جہاں کا
مادہ سے یہ سُن کے بول اُٹھا نر
وہ پیڑ جو حوض پر لگا ہے
اک سانپ ہے وہاں پہ چوٹ کرتا
لیکن جو یہ بندۂ خدا جائے
لپکے گا خود اس کو دیکھ کر سانپ
اُبھرے گا لگا کے جب یہ غوطا
اندیشہ نہ اپنے دل میں لائے
سب خشک ہے ایک ہی ہری ڈال
پہلے تو یہ لال پھل کو کھائے
پھر توڑ لے اُس کے سبز پھل کو

دشمن کا تھا سامنا کیا غور
بن میں ہری دوب چر رہی تھیں
گوبر کے انھیں کی چھوت پھینکو
گلخن سے دھواں دھویں سے اخگر
بادل میں چھپا وہ ماہ روشن
من ڈھونڈتے آپ کھو گئے وہ
شب کاٹ کے صبحدم سدھارا
مادہ لگی پوچھنے کہ او نر
کھلتا نہیں کچھ طلسم یاں کا
ہے طرفہ طلسم اس جگہ پر
طوبیٰ سے خواص میں سوا ہے
مارے سے نہیں کسی کے مرتا
تا حوض قدم قدم چلا جائے
مُنہ چادرِ آب میں یہ لے ڈھانپ
بن جائے گا آدمی سے طوطا
اُڑ کر یہ اُسی شجر پہ جائے
دو رنگ کے پھل ہیں سبز اور لال
انسان کا رنگ روپ پائے
پھل کچھ اُسے دے رہیگا کل کو

جس شخص کے پاس وہ تبر ہو ہتھیار نہ اُس پہ کارگر ہو
لکڑی میں اثر یہ ہے کہ دشمن بن جاتا ہے موم اگر ہو آہن
دو ہاتھوں میں لے جو کاندھے پہ سے اڑتا پھرے جیسے مرغ پر سے
ٹوپی جو بنائے چھیل کر چھال دکھلائی نہ دے نظر کی تمثال
پتے کی صفت بیان کیا ہو دم بھر میں بھرے جراحتوں کو
منہ میں رہے گوند اس کا جب تک لگتی نہیں بھوک پیاس تب تک
تھا مُلہمِ غیب مرغ گویا سُنتے ہی اُدھر چلا وہ جویا
کالے نے جہاں سے کی سیاہی وہ حوض میں تھا مثال ماہی
طوطا بن کر شجر پہ آ کر پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گوند چھال لکڑی اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی
ہاتھ آجو گئی عصا کی تاثیر پرّاں ہوا صورتِ عصا فیر
اُڑتا ہوا وہاں سے دور جا کر ٹھہرا دم لینے اک جگہ پر
من ران کو چیر کر چھپایا پتے سے وہ زخم سب بھر آیا
اک حوض پُر آب و تاب دیکھا سرچشمۂ آفتاب دیکھا
غوطا جو لگا کے سر اٹھایا وہ حوض وہ آب کچھ نہ پایا

....

نامردی سے اپنی نعرہ زن ہو بیچاری چلی کسی طرف کو
آگے سے جوان ایک خوش قد آتا تھا دنوں کی جیسی آمد

....

بارے جو پڑی گھر اُس کے بے قید
امید سے رہ گئی وہ نومید

جب جن کے نہلانے کا دن آیا
غوطہ کسی حوض میں لگایا

اُبھری تو نہ حوض تھا نہ وہ روپ
پانی کے عوض تھی دشت کی دھوپ

. . . .

گو شمع بنا چراغِ دامن
روشن نہ ہوا وہ رنگِ روغن

تھا مردمِ دیدۂ طلسمات
خالِ رُخِ دو رنگا رو مساوات

. . . .

زنبور سیاہ خال اُس کے
برگد کی جٹائیں بال اُس کے

گٹھا لئے سر پہ لکڑیوں کا
چلتی تھی سموم کا سا جھونکا

شہزادہ کہ تھا کمر پہ منظر
وہ روسیہ اُس کو سمجھی شوہر

گٹھا وہ دیا کہ بیچ لا جا
کیجو نہیں دیر جلد آجا

حیرت زدہ شاہزادہ ناچار
راہی ہوا سر پہ رکھ کے انبار

جب بڑھ کے ہوا نظر سے اوجھل
ہلکا ہوا پھینک پھانک بوجھل

واں سے جو بڑھا تو ایک چشمہ
پُر آب تھا چشمِ منتظر سا

غوطہ جو لگا کے سر اُبھارا
پایا وہی رنگ روپ سارا

کھویا ہوا مال ہاتھ آیا
بولا وہ کہ شکر ہے خدایا

خورشید مرا گہن سے چھوٹا
زنگ آئینہ بدن سے چھوٹا

یا رب یہی اب میں چاہتا ہوں
یہ چشمہ پھر آنکھ سے نہ دیکھوں

ناداں ہو جو آبرو کو کھوئے
اس پانی سے منہ اور ہاتھ دھوئے

یہ کہہ کر کاندھے رکھ کے لاٹھی / گھوڑوں پہ ہوا کے باندھی کاٹھی
کھانے کو شجر کا گوند تھا پاس / کیا دخل کہ بھوک لگتی یا پیاس
دیکھا ناگاہ کوہ البرز / اک دیو سیاہ تھا لئے گرز
ٹوپی جو سر پہ چھال کی تھی / عریانی میں پر وہ حال کی تھی
اُس دیو کے آگے سے بڑھا وہ / سایا سا پہاڑ پر چڑھا وہ
گریاں لبِ حوض اک پری تھی / فوارے کی طرح رو رہی تھی
پُرجوش و خروش اُسے جو پایا / روپوش نے تاجِ سر اٹھایا
دیکھا جو پری نے آدمی زاد / آہستہ کہا کہ خانہ برباد
رستا ترا کھو گیا کہاں سے / کھا جائے گا دیو بھاگ یہاں سے
بولا وہ بشر کہ دیو کیسا / ہم کو تو ملا نہ کوئی ایسا
بولی وہ پری کہ جا کہا مان / سر پر ہیں قرے قضا کے سامان
بولا وہ کہ بے قراری کیا ہے / تم اپنی کہو ہماری کیا ہے
کیوں روتی ہو کس کی یاد میں ہو / کیا رنج ہے کس فساد میں ہو
بولی وہ حسیں کہ میں پری ہوں / اس دیو کے بس میں آ گئی ہوں
فردوس کا بادشہ مظفر / روح افزا جس کی ہوں میں دختر
سردار کروڑ دیووں کا ہے / سلطانِ ارم مرا چچا ہے
اک دن میں چلی چچا کے گھر کو / ماندی تھی بکاؤلی خبر کو
رستے سے یہ دیو پھانس لایا / اب تک تو خدا نے ہے بچایا
نام اُس سے بکاؤلی کا سُنکر / رونے جو لگا وہ سر کو دھن کر

پوچھا اس نے کہ آدمی زاد | تو کیوں رویا کہا کہ فریاد
واں خرمنِ عیش پر پڑی برق | یہاں بحرِ فسوں میں ہیں ہوا غرق
وہاں پھانس چبھی ہے اس کو غم کی | یہاں سانس نہیں ہے ایک دم کی
بولی وہ کہ چھوٹتے اگر ہم | رکھتے ترے زخم دل پہ مرہم
بولا وہ کہ چل کہا کہ ناداں | وہ دیو کہاں۔ کہاں تو انساں
دیوؤں سے بھی لڑ سکا ہے کوئی | سائے کو پکڑ سکا ہے کوئی
بولا وہ کہ جی بجھا نہ جانی | دیو آگ تو آدمی ہے پانی
ہر چند کہ انس و جاں میں ہے لاگ | دب جاتی ہے مشتِ خاک سے آگ
بولی وہ کہ سن تو آدمی زاد | وہ دیو ہے تیری کیا ہے بنیاد
تجھ پاس تو ایک عصا ہے جانی | لاٹھی سے جدا نہ ہوگا پانی
بولا وہ کہ یہ جو لٹھ دھرا ہے | موسیٰ کا عصا ہے اژدہا ہے
یہ کہہ کے جتائے جوہر اپنے | ساماں دکھلائے یکسر اپنے
ٹوپی جو اتار لی تھی سر سے | پھر رکھ کے نہاں ہوا نظر سے
لٹھ کاندھے پہ رکھ ہوا پہ جاکر | ظاہر ہوا ٹوپی کو اٹھا کر
یہ شعبدہ دیکھ کر پری نے | اُڑ چلنے کے پائے کچھ قرینے
تسکین جو ہوئی پری کے جی کو | وہ آدمی لے اڑا پری کو
وہ دیو پری کو اڑتے پا کر | اُچکا تو ملا ہوا پہ جا کر
شہزادے نے اپنی سر کی ٹوپی | جلدی سے پری کے سر پہ رکھ دی
بدلی میں چھپی وہ ماہ روشن | بجلی سا عیاں ہوا یہ پُرفن

وہ دیو کہ تھا پری پہ لپکا — حیرت زدہ آدمی پہ لپکا

شہزادہ کہ لٹھ سے برق دم تھا — بادل سا ہوا کا ہمقدم تھا

دیکھا جو نہ دیو نے گذارا — پتھر اک اٹھا کے پھینک مارا

وہ سنگِ گراں حربۂ غول — تاثیر سے پھل کے بن گیا پھول

لٹھ اس کا پڑا تو وہ ہوا چور — جس طرح عصا سے جامِ بلور

غل کرکے زمین پر گرا دیو — موجود ہوئے ہزار ہا دیو

بادل کی طرح جو امڈے دشمن — لاٹھی سے ہوا وہ برق خرمن

موسیٰ کا عصا تھا لٹھ جواں کا — ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکا

سرمہ کیا کوہ پیکروں کا — جی چھوٹ گیا دلاوروں کا

ٹوپی کو اتار کر پری نے — چومے قدمِ بشر پری نے

شہزادے نے تاج سر پہ رکھا — لٹھ کاندھے پہ دل سفر پہ رکھا

فردوس میں جا کے صورتِ حور — ماں باپ سے آملی وہ مہجور

دیووں کی وہ سرکشی سنائی — انساں کی وہ مردمی جتائی

سُن سُن کے اُڑے حواس اُن کے — لائے نہ یقین قیاس اُن کے

پوچھا کہ وہ ہے کہا کہ ہاں ہے — پوچھا کہ کہاں کہا یہاں ہے

یہ سُنتے ہی اس نے تاج اٹھایا — حیرانوں کو شعبدہ دکھایا

بال اُس کے وبال سے بڑھے تھے — ناخن بھی ہلال سے بڑھے تھے

تن خاکی تھا جاں آتشیں تھی — عُریانی قبائے پوستیں تھی

صورت سے فقیر تھا بروگی — کی آؤ بھگت سمجھ کے جوگی

حسن آرا اس پری کی مادر ‏ ‏ ‏ باپ اس کا بادشہ مظفر
قدموں پہ گرے کہا ادب سے ‏ ‏ ‏ حرمت رہی آپ کے سبب سے
بولا وہ خدا خدا کرو واہ ‏ ‏ ‏ ہے جملہ جہاں کا مالک اللہ
قادر وہی کبریا وہی ہے ‏ ‏ ‏ آخر وہی ابتدا وہی ہے
بولی وہ کہ حق ہے جو ہے فرمان ‏ ‏ ‏ تم وقت کے اپنے ہو سلیمان
کھولو کمر آؤ لطف فرماؤ ‏ ‏ ‏ شربت پیو میوہ ہائے تر کھاؤ
بولا وہ کہ اشتہا کسے ہے ‏ ‏ ‏ کھانے کا قرار ہا کسے ہے
سیاح کو کیا قیام سے کار ‏ ‏ ‏ شبنم نہیں جاگزین گلزار
درویش رواں رہے تو بہتر ‏ ‏ ‏ آب دریا بہے تو بہتر
روح افزا بول اٹھی اجی واہ ‏ ‏ ‏ ہم جانے نہ دیں گے تم کو واللہ
آرام کرو کرم کرو آؤ ‏ ‏ ‏ ہم رام ہوئے نہ رم کرو آؤ
مجمع سے الگ مکاں میں لائی ‏ ‏ ‏ آرام کی جا قرار پائی
اصحاب نیاز کھانے لائے ‏ ‏ ‏ ارباب نشاط گانے آئے
تھا اپنے ہی سوچ میں وہ سلطان ‏ ‏ ‏ دھن راگ کی تھی نہ رنگ کا دھیان
بے وقت وہ راگ خوش نہ آیا ‏ ‏ ‏ بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

آنا بکاؤلی کا روح افزا کی خبر کو جمیلہ کے ساتھ اور تاج الملوک سے مل کر جانا سات دن بعد

بچھڑوں کے جو ملنے کا بیاں ہے ‏ ‏ ‏ یوں خامہ خوشی سے تر زباں ہے

روح افزا کو جو کھو کے پایا | مژدہ شاہِ ارم تک آیا
جانا تھا یگانگی میں لازم | چلنے کو ہوئی جمیلہ عازم
وہ ساکنِ خانۂ سلاسل | یعنی وہ بکاؤلی بیدل
کہتی تھی کہ پیچ سے نکلتی | خواہاں یہ ہوئی کہ میں بھی چلتی
سُن کے قیدی کے زار نالی | زنجیر کے پیچ سے نکالی
تخت اُن کی سواریوں کے آئے | اُڑتے وہ ہوا کے جھونکے آئے
بانوئے شہِ ارم جمیلہ | دخت اُس کی بکاؤلی عقیلہ
روح افزا سے ہوئیں بغل گیر | صورت پوچھی کہا کہ تقدیر
کہہ سُن کے مبارک و سلامت | بیٹھ اُٹھ کے ہوئی جمیلہ رخصت
روح افزا نے کہا کہ جی جان | تم جاؤ رہیں بکاؤلی جان
خاطر سے کہا کہ خیر لیکن | لیجاؤں گی خود میں ساتویں دن
یہ کہہ کے وہ وحشتِ مجسم | آہوسی ارم کو کر گئی رم
روح افزا نے کہا بہن سے | بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گلگشت کریں چلو کہا خیر | کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
چل پھر کے ہنسی ہنسی میں پوچھا | کھونا ملنا بہن یہ کیا تھا
روح افزا نے کہا کہ ہمشیر | میں نے یہ سنا کہ تو ہے دلگیر
واللہ کہ چھان کر خدائی | تیرے پیارے کو ڈھونڈ لائی
سمجھی وہ ہنسی کہا سخن ہو | ناداں ہو کیا کہوں بہن ہو
ہم کو یہ ہنسی نہیں گوارا | پیارا ہوئے گا وہ تمہارا

پیارا جو نہ تھا تو کھو گئیں کیوں — بد راہ بھی آپ ہو گئیں کیوں
بولی وہ آشنا تمہارا — پیارا نہیں پیارے کا ہے پیارا
گر اس کی تلاش میں ہیں کھوئی — بد راہ نہ کہہ سکے گا کوئی
جو چاہو کہو جواب کیا دوں — قائل نہیں ہوتی ہو دکھا دوں
وہ جوگی وہ دھونی اور وہ آسن — دکھلایا تو تھی اسی کی جوگن
دیکھا تو دکھا رہی ہے تقدیر — کوشش کا اثر کشش کی تاثیر
روح افزا ان کے بیچ میں واں — قالب تھی میان جان و جاناں
دونوں کا بدل تھا وصل منظور — مانند حباب ہو گئی دور
وہ غرقۂ بحر ظلم و بیداد — دریا رویا سنا کے افتاد
خاطر کی کدورتیں عیاں کیں — چشموں کی صورتیں بیاں کیں
رو رو کے پکاری دل افگار — بولی کہ خدا کو علم ہے یار
پھرتا تھا تو چشم و دل میں میرے — دیدے مرے نقش پا تھے تیرے
مشکل سے مجھے اپنا تھامنا تھا — ہر وقت قضا کا سامنا تھا
ہم چشم پھرے تھے مثل مژگاں — ہمسایہ تھے کشیدہ داماں
گھر میں رہنا گراں تھا میرا — زنجیر کا گھر مکاں تھا میرا
جو کہہ کے سخن پکارتا تھا — پتھر سا کھینچ مارتا تھا
سختی سہی یا کڑی اٹھائی — افتاد تھی جو بڑی اٹھائی
طالع سے کسے تھی (الہی) امید — نکلا ہے کدھر سے آج خورشید
کیوں منہ پہ شفق خوشی سے پھولی — کیا شام وصال راہ بھولی

یہ کہہ کے ملے بہم وہ ایسے — صفحے خطِ توأماں کے جیسے
اک جان دو تن تھے سرو بالا — صحبت کا مزا ہوا دوبالا
درباں سی تھی در پہ روح افزا — تھا پیش نظر حیا کا پردا

....

بول اُٹھی بکاؤلی کہ واری — محرم کا ہے کام پردہ داری
وہ بولی مجھے تو کچھ نہ آیا — تم نے مگر اب تو یہ سکھایا
کیا جانیں ابھی پڑا ہے کیا کیا — اس عمر میں سیکھنا ہے کیا کیا
بارے وہ مہ دو ہفتہ باہم — یک ہفتہ رہی انیس و ہمدم
سمجھی ہفتے کی میہمانی — ہر ہفت عروس شادمانی
وعدے پہ جمیلہ ساتویں دن — آئی تو تھا حیلہ غیر ممکن
ساتھ اس کے رواں ہوئی وہ گلرو — ہوش اس کے ہوا ہوئے کہے تو
چاہا کہ وہ تاج رکھ کے سر پر — رہیے روپوش ساتھ چل کر
دامن کو پکڑ کے روح افزا — بولی کہ کدھر کیا ارادا
الفت کے بہت نہ جوش میں آؤ — کچھ خیر ہے تم کو ہوش میں آؤ
نافہمی سے خوار ہو چکے ہو — اب تو سیکھو کہ کھو چکے ہو
کار مشاطہ خود نہ کیجے — انگارے کو ہاتھ سے نہ لیجے
جلدی تمھیں کیا ضرور دم لو — بیدل نہ ہو قول لو قسم لو
گھبراؤ نہ پاس کے نامرادی — غم کھاؤ جو چاہتے ہو شادی
سوچا تو نہ تھا صلاح اُلجھنا — دانائی تھی بات کا سمجھنا

پیغام لیجانا حسن آرا کا بکاؤلی کی شادی کے واسطے

بیدل نے جگہ جو جی میں پائی — یوں خامے نے کی زباں کشائی
وہ شکر گذار روح افزا — ماں سے بولی کہ حسن آرا
واجب ہے ادا کیے حق مہماں — احساں کا عوض نہیں جز احساں
حسن آرا نے کہا کہ بہتر — جو اپنے سے ہو نہیں ہیں باہر
بولی وہ کہ یہ فقیر جوگی — ہے عشق بکاؤلی کا روگی
میں اس کے سبب بچی ہوں جی سے — یہ میرے سبب ملے پری سے
راز اُن کا کیا جو آشکارا — راضی ہوئی سن کے حسن آرا
بلوا کے مصوّر اک کہن سال — کھنچوا لی اُس آدمی کی تمثال
وہ صورتِ حال ارم میں لائی — خلوت میں جمیلہ پاس آئی
چھیڑا کہ ہو مہ سے عقد پرویں — پیوند نہال گل ہو نسریں
واجب نہیں اب تامل اس میں — بھرئیے وہیں تک نہ چھلکے حسن میں
بولی وہ جمیلہ کیا بتاؤں — تو اپنی ہے تجھ سے کیا چھپاؤں
سودا ہے مری بکاؤلی کو — ہے چاہ بشر کی باولی کو
مشہور ہے ضد انس و جانی — یکجا نہیں رہتے آگ پانی
حسن آرا نے کہا جمیلہ — مجھ کو یہ نہیں پسند حیلہ
کاوش تری بے ثبات ہے یہ — سو بات کی ایک بات ہے یہ
دو دل جو ہوں چاہئے یہ راضی — یہ جان لے کیا کرے گا قاضی

بولی وہ جمیلہ ہوش ہیں آؤ
جا کر کسی اور کو یہ سمجھاؤ

تجویز کی آپ کے میں قرباں
بہکائے پری پری کو انساں

حسن آرا نے کہا کہ خاموش
شعلہ کو کیا ہے کس نے خس پوش

اسباب نہ جمع کر ضرر کے
رکھ پنبہ نہ داغ پر شرر کے

بولی وہ جمیلہ پھر کروں کیا
وہ بولی نہ سمجھی کہتی ہوں کیا

جب دل ہی پری کا آگیا ہے
انساں ہے تو کیا مضائقہ ہے

انساں ہی تھے حضرت سلیماں
انساں ہی تھے مسیح دوراں

یہ قطرۂ بحر کبریائی
دریا ہے جو ہوئے آشنائی

کیا شکوہ اگر پری نہ سمجھے
افسوس جو آدمی نہ سمجھے

دم ڈھلے گئے ہیں رشتۂ نفس کے
پھندے ہیں پھنسا ہی پیش و پس کے

بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کے ساتھ اور رہنا ارم میں

شادی کے لئے ہے کلک شنجرف
انگشت قبول دیدۂ حرف

حسن آرا تھی جو نیک تدبیر
دکھلائی جمیلہ کو وہ تصویر

پہچان کے خال و خط سے انداز
وہ چپ جو رہی تو یہ سخن ساز

بولی کہو کیوں کہا کہ مانا
پر کھوئے ہوئے کا کیا ٹھکانا

وہ بولی کہ اس سے تجھ کو کیا ہے
ہم نے تو سمجھ کے کچھ کیا ہے

ٹھہری یہ غرض کہ آج کی رات
فیروز شہ آگے چھیڑیے بات

جب سونے کو وہ محل میں آیا
افسانۂ عشق اسے سنایا

یاد اُس نے کیا بکاؤلی کو　　لے آئے اُڑا کے اُس پری کو
تصویر بشر دکھائی اُس نے　　شادی کی خبر سنائی اُس نے
دیکھا تو نہ فرق تھا سرِ مو　　جانچے خط و خال و چشم و ابرو
نقشے سے وہی نگار پایا　　قسمت کا لکھا سا آگے آیا
کہنے لگی دل میں یا الٰہی　　شر ہو نہ کہیں یہ خیر خواہی
پیارے سے نہ ہو خلاف وعدا　　کیا سوچتی ہوں نصیب اعدا
دیکھا تو وہ بھیدی حسن آرا　　کرتی تھی اُسی کے رُخ نظارہ
روح افزا کا جو آگیا دھیان　　تسکین ہوئی آئی جان میں جان
جاتا کہ بہار فصل سے ہے　　یہ نقل مطابق اصل سے ہے
اقرار میں تھی جو بے حیائی　　شرمائی لجائی مسکرائی
حسن آرا نے کہا مبارک　　ایجاب اس نے کیا مبارک
سج دھج یہ بنی ادھر بنائے　　بن ٹھن کے بنا اُدھر سے آئے
سیّارہ شناس کو بلایا　　ساعت ٹھہرائی دن دکھایا
شادی کی خبر سے خوش خوش آئی　　مشتاق کو خوش خبر سنائی
راتوں کو جو گنتی تھی ستارے　　دن گِننے لگی خوشی کے مارے
واں مہندی نے چومے پائے خورشید　　یاں سبز ہوا نہالِ اُمیّد
وہ واں پہ گلاب سے نہائی　　یاں تازگی آبرو نے پائی
واں غازہ سے رُخ شفق میں خورشید　　یاں جم گیا منہ پہ رنگِ امیّد
افشاں ہوئے واں ستارہ افشاں　　یاں چیغہ سے روشنی دو چنداں

واں مانگ سے رنگِ کہکشاں ماند — یاں شملۂ سر سے ہالے میں چاند
واں زلف نے کھائے پیچ پہ پیچ — طُرّہ کلغی پہ یاں تھا سرپیچ
آنچل ہوئے واں نقابِ عارض — سہرا ہوا یاں حجابِ عارض
زیبا ہوا واں بدن پہ گہنا — یاں جامۂ وفا کا اس نے پہنا
واں گُل سے بہارِ بوستاں ہے — آرائشِ تختِ گُل یہاں ہے
الماس کے واں تھے جھاڑ فانوس — یہاں جلوہ فروشِ تختِ طاؤس
مہتاب سے چاندنی کا واں فرش — یاں چرخی سے چرخ میں سرِ عرش
واں جلوے حنائی انگلیوں کے — یاں روشنی کے تھے پنجشاخے
بادل سے وہ وہاں گرج رہے تھے — یہاں دھوم سے باجے بج رہے تھے
واں پریوں میں ذکرِ آدمی زاد — نوشہ کی جلو میں یاں پریزاد
گلگوں تھا کسی کا بادِ رفتار — گلرنگ کسی کا تھا ہوادار
ہاتھی تھے تو مستیوں کی دہشت تھی — گھوڑے تھے تو چابکی کی لذت تھی
وہ ماہ کہ تھا سوارِ شبدیز — تھا پا بہ رکاب شوقِ مہمیز
در تک جو برات اُدھر سے آئی — کی سب نے ادھر سے پیشوائی
فیروز مظفر ایسے دو شاہ — پر نور تھے جیسے مہر اور ماہ
بارانِ گلاب و بارشِ گُل — ہو کر بڑھے آگے با تجمل
سلطان فیروز رشکِ جم تھا — نوشہ مسند پہ جم کے بیٹھا
ہر بالے بنے کا شور و غل تھا — سنبل کا چنور تو چتر گل تھا
گُل سے خوانوں میں زردہ لایا — آن غنچہ دہانوں کو کھلایا

خورشید سا آفتابہ لائے   منہ ہاتھ ہر ایک کے دھلائے
قلیاں پیے مشکبو دھواں دار   بیڑے پچکھے پان کے مزیدار
جب عقد کی ان کے ساعت آئی   دو رشتوں میں اک گرہ لگائی
یک جا کیے وہ عروس و داماد   وہ جان پری یہ آدمی زاد
حیرت نے آئینہ دکھایا   شربت دیدار نے پلایا
زلفیں ہوئیں چہرے کی بلا چیں   ٹونا وہ نگاہ سحر آگیں
جو چہرۂ آتشیں پہ تل تھا   اسپند نگاہِ بد بدل تھا
جوڑی جو ملی بنے بنی کی   سنگت ہوئی راگ راگنی کی
جو گائنیں تھیں شہانے گائیں   لیتے ہوئے نیگ راگ لائیں
حق پا کے جو رکھتی تھیں ندامت   بولی اٹھیں مبارک و سلامت
پیارا تھا بنے بنی کا جوڑا   خلوت میں دولھا دلھن کو چھوڑا
پریاں کہ ہزار ہا بھری تھیں   ارمان سی سب وہاں سے نکلیں
بے پردگی ہوئی تھی جو ان میں   دروازوں نے بند کر لیں آنکھیں

جب اوڑھی عروسِ مہ نے چادر   نکلا پردے سے شاہِ خاور
ثابت وہ جو شب کو تھے ستارے   خورشید نکلتے ہی سدھارے
یعنی دولھا دولھن سحرگاہ   نکلے آرام گہ سے دلخواہ
منہ گھر کو براتیوں نے موڑا   محظوظ دولھا دولھن کو چھوڑا
وہ حوضِ گلاب میں نہایا   یاں رخ پہ عرق گلاب پایا

واں جوڑا چست تنگ بدلا | یاں جوڑے کے منہ کا رنگ بدلا
وہ راگ کا دیکھنے لگا رنگ | یاں پردے میں چھیڑ تھی خوش آہنگ

رخصت ہونا تاج الملوک کا بکاؤلی کو لیکر اور آنا گلشن نگارین میں

غربت سے جواب میر وطن ہے | کلک دو زباں یہ حرف زن ہے
شادی ہو کر وہ خانہ آباد | سوچا کہ بنا ہیں خانہ داماد
غربت میں وطن کی دھن سمائی | اس فیں کو یاد ہند آئی
خلوت میں ہوا پری سے گویا | دنیا میں ہیں سب وطن کے جویا
پانی تہ خاک کو رواں ہے | لَو شعلے کی سوئے آسماں ہے
عزم سفر وطن سمجھ کر | بولی وہ بکاؤلی کہ بہتر
چلئے لگا تو ساتھ ہیں بلا عذر | رہئے گا تو بندگی میں کیا عذر
ہاتھ اس کا پکڑ کے باہر آئی | ماں باپ کے پاس دختر آئی
ہوتے ہی دو چار خویش و دختر | دو سے ہوئے چار اُس جگہ پر
وہ تینوں تھے قوم کے پریزاد | جو تھا ان میں یہ آدمی زاد
چومی اس نے زمین خدمت | غربت سے وطن کی چاہی رخصت
فیروز شہ و جمیلہ بانو | دونوں ہوئے سُن کے سر بزانو
غوطے میں جو آ گئے وہ یکسر | بولی ماں باپ سے وہ دختر
پردیسیوں سے جو کی ہے نسبت | اب کیجے ہنسی خوشی سے رخصت
دعویٰ نہیں کچھ دئے ہوئے پر | قائم رہئے کئے ہوئے پر

لازم جو ہو اس میں کد نہ کیجئے — سائل کا سوال رد نہ کیجئے
بولی وہ کہ بخت تھا زبردست — خورشید کو ذرے نے کیا پست
انساں سے جھکی پری کی گردن — کانٹے سے رکا ہوا کا دامن
یہ کہکے منگائے دو ہوا دار — سو دیو بلائے بادرفتار
ہوکر دیوؤں کی زینتِ دوش — رخصت وہ اُدھر ہوئے ادھر ہوش
اشکوں سے شگون لیا نرالا — آئینہ رُخ پہ پانی ڈالا
سو بنا مختار کو جو مجبور — گھر پاس تھا اور وہ منزلوں دور
آئے تو وہ باغ سحر بنیاد — تھا آب وہوائے خوش سے آباد
خیل و خدم اس کے منتظر تھے — مانند حواس منتشر تھے
پہچان کے سب نے غل مچایا — آیا تاج الملوک آیا
داخل جو ہوئے محل کے اندر — محمودا لپکی دوڑی دلبر
پوچھا خوش خوش کہا کہ دم لو — دیکھو یہ کون ہیں قدم لو
دلبر یہ وہی بکاؤلی ہے — محمودا دیکھ کیا پری ہے
سبحان اللہ کہہ کے دلبر — بولی کہ یہ گھر ہوا منور
محمودا نے کہا مبارک — خوشنودی آشنا مبارک
اُن مختصروں نے جب دیا طول — بولی وہ بکاؤلی کہ معقول
یہ سمجھو تو کچھ نہیں ہے تکرار — خوش پوش ہے ایک جوڑے دو چار
درجے درجے رہیں وہ ذی ہوش — ہمخانہ و ہمدم و ہم آغوش

طلب ہونا بکاؤلی کا راجا اندر کی محفل میں اور آگاہ ہوکر ہمراہ جانا تاج الملوک کا

تقدیر سے ہیں جو شادی و رنج — اب یوں نئے خامہ ہے نواسنج

از بسکہ یہ چرخ فتنہ انگیز | ہے خرمنِ عیش پر شرر ریز

یکچند وہ مہ تھی کاہشوں میں | گذری اک عمر خواہشوں میں

تقدیر سے جب مراد پائی | راجا اندر کو یاد آئی

اندر اسن امر نگر ہے شہر ایک | خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک

اندر ہے پادشاہ اُس کا | آسن ہے تخت گاہ اُس کا

مضمون وہ قضا سے اس قدر ہے | اُس بستی کا نام امر نگر ہے

یزدانیوں کا ہے مسکن اُس میں | روحانیوں کا نشیمن اُس میں

کہتے ہیں مورخانِ ہندی | آباد ہوا پہ ہے وہ بستی

راجا کہ کمالِ پارسا ہے | مقبولِ جناب کبریا ہے

خالق نے دیا ہے فوق اس کو | نغمے سے ہے ذوق شوق اُس کو

انساں کا سرود و رقص کیا ہے | پریوں کا ناچ دیکھتا ہے

باری باری سے جو پری ہے | راجا اندر کی مجرئی ہے

لیکن جو بکاؤلی دل افگار | باری پہ پہنچ سکی نہ بیمار

اک شب راجا تھا محفل آرا | یاد آئی بکاؤلی دل آرا

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے | شہزادی بکاؤلی کدھر ہے

منہ پھیر کے ایک مسکرائی | آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتوں کو ملا کے رہ گئی ایک | ہونٹوں کو ملا کے رہ گئی ایک

بولا وہ کہ چپ ہو کیوں سبب کیا | بولیں وہ کہ کہئے بے ادب کیا

ناتا پریوں سے اُس نے توڑا | رشتہ اک آدمی سے جوڑا

وہ سن کے خفا ہوا کہا جاؤ | جس طرح سے بیٹھی ہو اٹھالاؤ
پریاں اُڑیں اوپر اوپر آئیں | مہتابی پہ مثل ابر چھائیں
دیکھا تو وہ دونوں کرتے تھے خواب | گل تکیے تھے آفتاب و مہتاب
ہم بستر آدمی پری تھی | سایے کی بغل میں چاندنی تھی
غافل جو موکلوں نے پایا | اس نقش مُراد کو جگایا
جاگی تو سب اس کے جوڑ کی تھیں | اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں
بولیں کہ طلب کیا ہے چلیئے | جوڑا یہ خراب ہے بدلیئے
اُٹھی اُسے جی کی طرح چھوڑا | بدلا مانند رنگ جوڑا
ساتھ ان کے وہ تا بمحفل آئی | لرزاں لرزاں مقابل آئی
راجا نے نگاہ کی غضب سے | پوچھا کہ یہ بے حیائی کب سے
بو آتی ہے آدمی کی لیجاؤ | ناپاک ہے آگ اسے دکھلاؤ
شعلہ سا پری کا جسم کانپا | مُنہ دامن اشک تر سے ڈھانپا
پریوں نے کشاں کشاں نکالا | صندل آتش کدے میں ڈالا
کافور سی جل اُٹھی سراپا | ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا
جو آتش گل نہ لے چمن سے | جھونکا اسے آگ میں جلن سے
جس رُخ پہ تھی کاکل معنبر | تھا چشم زدن میں دود اخگر
جس جسم پہ تھی نفیس پوشاک | شعلے کے سوا نہ کچھ بھی تھا خاک
عیسیٰ نفس ایک خضر آئی | چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی
شعلے سے زیادہ پاک داماں | آکر ہوئی انجمن میں رقصاں

ناچی گائی غریب ناچار — اغیار ادا سے کر لئے یار

برخاست کا وقت صبحدم تھا — راجا وہ کہ صاحب کرم تھا

بولا جا یوں ہی آئیو روز — جل بجھ کے سدا اُٹھائیو سوز

رخصت پاتے ہی وہ ہوائی — پرّاں پرّاں ہوا سی آئی

پشواز کنار حوض اُتاری — شب کی پوشاک پہنی ساری

بیتاب آرام گہ تک آئی — ہمخواب کی آنکھ بند پائی

یوں سیج پہ آ کے سوئی بیتاب — جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب

وہ آہوئے مست خواب خرگوش — یعنی تاج الملوک بے ہوش

اس شب کو بغل میں آ کے جاگا — پر دوسری شب وہ جا کے جاگا

دیکھا تو وہ متصل نہیں ہے — پہلو میں جگر کے دل نہیں ہے

حاجت کے گماں سے جب ہوئی دیر — جھنجھلا کے پلنگ سے اٹھا شیر

دائیں دیکھا نظر نہ آئی — بائیں دیکھا کہیں نہ پائی

عورت تھی گمان بد سے کھٹکا — جانا کہیں دل کسی سے اٹکا

اٹھ در نظر آیا در کا سایہ — سمجھا وہ پلنگ چار پایہ

آنکھوں میں جو چھا گیا اندھیرا — پل مارتے ہو گیا سویرا

جاگا تو پری بغل میں پائی — وہ نقش وفا عمل میں پائی

دل نے خبر ہوا نہ بیتاب — گویا کہ وہ شب کا حال تھا خواب

جب مہر فلک گیا لب بام — ہنستا ہی پہ آیا وہ سر شام

معمول سے بزم میں سوئے جمع — مینا و کباب و مجمر و شمع

جام اس نے بھرا کہا پیالے — دل اس کا بھرا تھا جام کیا لے
ٹھانی تھی کہ آج رہ کے بیدار — دیکھوں جاتی کہاں ہے عیّار
بولا کہ ہیں درد سر کے کچھ طور — میں آج نہ ہونگا شاملِ دور
ہٹ اُس نے جو کی تو ہاتھ مارا — شیشہ ہوا چور چور سارا
ہوتی ہے جو نوکِ شیشہ نشتر — چرکے لگے اُس کی انگلیوں پر
بیداریِ شب کی گھات پائی — حکمت سرِ دست ہاتھ آئی
کف میں نمکیں کباب لے کر — چھڑکا نمک ان جراحتوں پر
بند آنکھیں کئے ہوئے شکر لب — بیدار رہا تو آخر شب
پریوں نے ہوا سے تخت اُتارا — ثابت ہوا ٹوٹتا ستارا
سوتا اسے جان کر اُٹھی وہ — پوشاک بدلنے کو گئی وہ
اُس تخت کا یہ پکڑ کے پایہ — پوشیدہ ہوا برنگ سایہ
بن ٹھن کے جب آئی رشک ناہید — ذرہ ہوا ہمرکاب خورشید
جاتے ہی زمیں سے آسماں پر — پہونچی اُس بزم میں سماں پر
لوگوں سے بھرا وہ دائرہ تھا — پر صورت وصدا وہ دائرہ تھا
ٹھنکے پہ پہنچ کے تخت ٹھہرا — مرکز پہ وہ نجم بخت ٹھہرا
آتشکدہ پریوں نے بنا کر — پھینکا اُسے پھول سا اُٹھا کر
شہزادہ کہ زیر تخت زرکار — تھا پہلوئے گل میں صورتِ خار
فریاد نہ کرنے پایا مضطر — تاباں ہوئے راکھ میں سے اخگر
راجا جس رخ تھا محفل آرا — دل لیتی ہوئی چلی دل آرا

ہمراہ چلا وہ چھوڑ پایہ — آگے تھی پری تو پیچھے سایہ
محفل میں جو آئی شمع محفل — پروانوں کا ہاتھ سے گیا دل
جو گاتی تھیں بیٹھیں مثل آواز — مجرے کو اٹھی وہ صورت ناز
وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی — خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی
رقص اُس کا اگرچہ خوشنما تھا — سنگت کا پکھاوجی تھڈکا تھا
شہزادے نے دیکھ دائیں بائیں — لیں طبلہ نواز کی بلائیں
آہستہ کہا کہو تو آؤں — فرماؤ تو بندگی بجاؤں
اُس نے جو پکھاوج اس کو دیدی — کیفیت اتفاق نے دی
تھا سم پہ یہ اُس پری کا نقشا — سب آنکھ ملا کے کہتے تھے آ
محظوظ کیا جو سب کو یکبار — بخشا راجا نے نولکھا ہار
انداز سے اس نے لے کے مالا — کاندھے پہ پکھاوجی کے ڈالا
برخاست کا تھا وہ رخصتی ہار — برہم ہوئی بزم اٹھے سب اکبار
لے ہار وہ شاہزادہ فی الفور — پنہاں ہوا زیر تخت اُسی طور
بادِ سحری چلی جو سن سے — وہ شمع سدھاری انجمن سے
خورشید سے پہلے اُڑ کر آئی — تاروں کی چھاؤں میں گھر آئی
وہ حوض کے رُخ چلی اُتر کر — یہ آنکھ بچا کے سوئے بستر
وہ آئی تو غافل اُس کو پایا — آغوش میں آ گلے لگایا
جب پردہ صبح ہو گیا فاش — خنداں خنداں اٹھا وہ بشاش
اس غنچہ دہن کا مسکرانا — بے رنگ بکاؤلی نے جانا

ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں بے سبب کوئی یوں
بولا کہ وہ خواب دیکھتا تھا — آتش پہ کباب دیکھتا تھا
بولی وہ کہ ہم بتائیں تعبیر — دل سوزی کرے گا کوئی دلگیر
بولا وہ کہ رات کو افق میں — خورشید تھا آتش شفق میں
بولی وہ کہ دہر سے شب و روز — عالم میں نہ ہوگے رونق افروز
بولا وہ کہ اک مقام ہوٗ تھا — گلزار خلیل روبرو تھا
بولی وہ بشر ہو تم دلاور — سرسبز ہو قوم آتشی پر
بولا وہ کہ دیکھی اک شبستاں — شعلہ ہوا انجمن میں رقصاں
بولی وہ کہ شعلہ میں پری ہوں — جو ناچ نچاؤ ناچتی ہوں
بولا وہ کہ جب ہوا اُجالا — بخشا مہ انجمن نے بالا
بالا مہ انجمن کا کیا تھا — وہ ہار تھا جو گلے پڑا تھا
گھبرائی پری کہ ہیں یہ کیا ہے — بولا کہ وہ ہار نولکھا ہے
کاندھے پہ تھا جس کے رات ڈالا — پہچانتی ہو وہ طبلے والا
کیوں جی یہ اکیلے شب کو جانا — اوپر اوپر مزے اُڑانا
یہ سُن کے پری وہ سوختہ تن — بولی کہ سُن اے صلاح دشمن
میں جل کے جلی تو غم نہیں ہائے — ڈر ہے کہ نہ تجھ پر آنچ آجائے
میرے جلنے پہ خاک ڈالو — تم نام نہ واں کے چلنے کا لو
افروختہ آتش حسد ہے — جلنا یہ سپند چشم بد ہے
بولا وہ کہ یہ نہ ہوگا مجھ سے — میں دو قدم آگے ہو نکا تجھ سے

سمجھاتی رہی اُسے وہ دانا — لیکن اُس نے کہا نہ مانا
عازم ہوا شب کو آتے ہی تخت — یا قسمت یا نصیب یا بخت
واں جا کے وہ سوچی اُسکو بے لاگ — لے چلئے تو راجہ لائے گا راگ
سنگت کا بکھاؤ جی بنا کے — گائی یہ غزل مقام پا کے

غزل

ساقی قدحِ شراب دیدے — مہتاب میں آفتاب دیدے
ساقی باقی جو کچھ ہو لے لے — باقی ساقی شراب دیدے
اس بت سے نہیں سوال کچھ اور — اپنے منہ سے جواب دیدے
لیلیٰ میں نے تجھے بنایا — مجنوں مجھ کو خطاب دیدے
اس گل سے نسیم زر نہیں مانگ — جو چاہے وہ بیحساب دیدے

نصف پتھر کا ہو جانا بکاؤلی کا راجا اندر کی بد دعا سے اور پتخانے میں رہ کر ملنا تاج الملوک سے اور کھدوانا پتخانے کا رانی چتراوت کے حکم سے

ہے اب جو بیان سنگ ساری — یوں پائے قلم ہوا ہے بھاری
خوش لہجہ بہت بکاؤلی تھی — گائی اور ناچی بڑی تھی
راجا نے کہا کہ خوش ہوں تجھسے — جو چاہے آج مانگ مجھ سے
دکھلا کے ہنسی بکھاؤ جی کو — مانگا کہ یہ دو بکاؤلی کو
ارمان یہی ہوس یہی ہے — خاطر کی مراد بس یہی ہے

مانگا جو بشر پری نے بیباک — راجا اندر ہوا غضب ناک

بولا کہ اس آدمی کی یہ تاب — لے چشمۂ آفتاب سے آب

کھویا تجھے تیری آرزو نے — جا تیری سزا یہی کہ تو نے

کی ہے حرکت خلاف آئین — پتھر کا ہو نصف جسم پائیں

اس سختی سے کچھ دنوں رہے تو — بعد اس کے خاک میں ملے تو

قالب ترا انقلاب کھائے — جامے میں تو آدمی کے آئے

بارہ برس اس طرح گزر کر — پھر تجھ کو ملے پری کا پیکر

اس وقت جہاں تو چاہے جائے — تو اس کو ملے وہ تجھ کو پائے

روئی وہ بکاؤلی یہ سن کے — تڑپا شہزادہ سر کو دھن کے

خواہش جو بلائے جاں ہوئی وہ — ہلکا ہوا یہ گراں ہوئی وہ

ناری تھی پری ہوا بنائی — خاکی تھا بشر زمیں جھنکائی

سایہ سا زمیں پہ جب گرا وہ — افتاد کو سوچنے لگا وہ

سبزے کی دھوپ چھاؤں مخمل — صحرا میں بچھی تھی سو گیا شل

چشمہ اک آفتاب سا تھا — عاشق کی طرح بھرا ہوا تھا

پریاں کچھ ادھر نہانے آئیں — دیکھا وہ بشر تو کھلکھلائیں

بولیں یہ وہی پکھاوجی ہے — عاشق جس پر بکاؤلی ہے

وہ چونک کے بول اٹھا کہ بلللہ — بتلاؤ کہاں ہے وہ کہا آہ

اندر کے غضب سے نکلے پتھر — ہے بت سی وہ ایک مٹھ کے اندر

پوچھا کہ کدھر کہا بہت دور — بولا وہ کہ پھر کہا کہ مجبور

یہ کہکے اُتاری سب نے پوشاک باہر ہوئیں جامے سے وہ بیباک

پردے کا جو کچھ خیال آیا تن چادرِ آب سے چھپایا

بے ننگ یہ سب نہا رہی تھیں موجیں باہم اڑا رہی تھیں

سونچا وہ کہ ان کو دیجئے جل خس پوش کئے وہ جامۂ گل

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں باہر بصد آب و تاب آئیں

پوشاک دھری ہوئی نہ پائی جانا کہ حریف نے اڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں رک رک کے قدم بڑھاتی آئیں

دکھلائی کسی نے چشم جادو چمکائی کسی نے تیغ ابرو

جھنجلا کے کہا کہ لاؤ مانو ہم کو بھی بکاؤلی نہ جانو

بولا وہ چہ خوش تم ایسی کیا ہو ڈرنے کا نہیں ہیں کیا بلا ہو

پوشاک جو لینی ہو تو پہنچاؤ بولیں وہ چلو کہا قسم کھاؤ

عریانی کی ننگ سے لجائیں ستار کی قسمیں سب نے کھائیں

شہزادے نے کرکے پاس اُن کا خلعت سا دیا لباس اُن کا

پریاں ہوئیں رخت سج کے خرسند ہو جیسے ہوا حباب میں بند

شانے پہ چڑھا کے مثل گیسو اُس گل کو اڑا یا صورتِ بو

واقف اُس تبکدے سے تھیں وہ سنگلدیپ اس کو لے گئیں وہ

وہ جائے بکاؤلی بتائی دیوانے کو باؤلی بتائی

بتخانے میں تھا طلسم کا در ششدر رہا چار سمت پھر کر

عقدہ کھلا شام ہو کر اس کا شق مثل قمر ہوا در اس کا

دیکھا تو وہ بت تھی مٹھ کے اندر
جسم آدھا پری تھا آدھا پتھر

. . . .

چومے جو قدم اس آدمی نے
سینے سے لگا لیا پری نے

نرمی سے کہا بخیر گزری
کس سختی سے تم بغیر گزری

ہم پر تو پڑے وہاں یہ پتھر
تم کیونکہ بچے کہا مقدر

گر پڑ کے زمیں پہ مثلِ شبنم
پھر پریوں کی گھر سے اڑے ہم

جذبہ تم پاس کھینچ لایا
سختی اب دور ہو خدایا

تا آخرِ شب فسانے کہہ کر
بولی وہ پری کہ اے دلاور

یہ در مانندِ چشمِ بے خواب
ہوتا ہے سحر کو بند بیتاب

پیش از دمِ صبح تم نکل جاؤ
کل پھر سرِ شام خیر سے آؤ

مصرف کو جو ہو ضرورتِ زر
زیور مرا مجھ سے لو یہ کہہ کر

کانوں میں سے موتی کچھ نکالے
دامن پہ مثالِ اشک ڈالے

صدقے وہ بشر ہوا پری کے
قدموں پہ گرا بکاؤلی کے

پاؤں اس کے چھوئے تو رخ سے پائے
آنسو چھوڑے گہر اٹھائے

نکلا جیسے ہی مٹھ کے باہر
پتھرا گئی چشم حلقۂ در

آنکھوں سے یہ دیکھتا ہوا گھر
آگے کو بڑھا چلا سوئے شہر

بازار میں جا کے بیچے گوہر
مفلس سے ہوا وہ صاحبِ زر

گھوڑا جوڑا نفر حویلی
جو جو شے چاہیے تھی لے لی

جب منزلِ شب میں رہروِ روز
لے گوہرِ شبنم آیا پر سوز

گنبد گردوں کا تھا جو بے در — تاباں ہوئے اُس میں ماہ و اختر
سیّاروں سے کر کے استخارا — اُس برج کے رُخ وہ مہ سدھارا
دیکھا تو درِ قبول وا تھا — رگڑا انھیں ایڑیوں پہ ماتھا
شب سایۂ زلف میں بسر کی — لی صبح کے ہوتے راہ گھر کی
تقدیر نے راستا بھلایا — راجا کے محل کی جانب آیا
چتراوت اس کی ماہ پارہ — غرفے میں سے کرتی تھی نظارہ
دیکھا تو جوان تھا یہ تصویر — صورت پہ فدا ہوئی وہ بے پیر
یاں پردہ در نظر سے گزرا — واں تیر نظر جگر سے گزرا
دستور تھا جس کو بیٹی چاہے — باپ اس کا اسی کے ساتھ بیاہے
راجا سے خوش خبر بیان کی — مشاطۂ خوش ادا رواں کی
شادی کی خبر سے وہ یکایک — خوش خوش آئی کہا مبارک
اس شہر کا چترسین راجا — دختر رکھتا ہے ماہ سیما
ہر ملک کے شہر یار آئے — ہر شہر کے تاجدار آئے
راضی تجھ سے ہوئی وہ بے پیر — طالع قسمت نصیب تقدیر
بیجا وہ ہوا کہا کہ جا جا — کیسی رانی کہاں کا راجا
دکھلا نہ مجھے ہرے ہرے باغ — غنچے کی گرہ میں کیا ہے جز داغ
الفت میں ہے آبرو گنوانی — کب چشمۂ مہر میں ہے پانی
مکّار تو مجھ سے کرتی ہے زور — دُر ہو مرے سامنے سے چل دور
ہٹ دیکھ کے اس کی ہٹ گئی وہ — قسمت کی طرح پلٹ گئی وہ

پایا جو جواب منتظر نے | آنکھوں میں لگا خیال پھرنے
تقدیر کی بات ہونے والی | زر سے ہوا اس کا ہاتھ خالی
من سانپ کا ران سے نکالا | بازار آیا وہ سرو بالا
کیا جوہری مول کرتے اس کا | راجا تک رفتہ رفتہ پہنچا
جو مدعیوں کا مدعا تھا | موقع وہ ملا تو کیا بُرا تھا
جھنجھلا کے ڈر کے غل مچا کے | سمجھا کے دبا کے دست پا کے
من چھین کے چوری کے بہانے | بھیجا کھلے بندوں قید خانے
زنداں میں وہ نیم جاں وہ بسمل | زنجیر میں پاؤں زلف میں دل
غم کھا کے لہو کے گھونٹ پینا | دم کے دھاگوں سے ہونٹھ سینا
داروغۂ محبس جفا نے | رانی سے کہا کسی بہانے
یوسف کی خبر لے آ زلیخا | زنداں میں ہے وہ عزیز مرتا
اس چاہ میں کام ہو نہ جائے | یہ ماہ تمام ہو نہ جلئے
دانا تھی وہ چیلخا نے آئی | بگڑے ہوئے کو منانے آئی
دیکھا تو سرنگوں تھا دلگیر | تھی حلقہ بحلقہ زلف و زنجیر
آنکھ اس سے نہ جب ملائی اس کنے | زنجیر اس کی ہلائی اس نے
پابند بلا وہ مبتلا تھا | کب اس کو خیال بند پا تھا
رانی نے جو بیدلی نگہ کی | بیڑی کٹوائی بے گنہ کی
قدموں پہ گری کہا اٹھو آؤ | انکار و گریز جانے دو آؤ
اٹھا وہ پری کی آرزو میں | یہ سمجھی کہ پھانسا گفتگو میں

وہاں دھن کہ صنم سے کد خدا ہوں | یہاں دھیان کہ بت کا پارسا ہوں
تجویز میں اپنے اپنے مفہوم | آئی تو محل میں مچ گئی دھوم
راجا نے ستارہ داں بلایا | سعدین کا زائچہ ملایا
دن ڈھلکے وہ ماہ نو سرِ شام | غائب ہوا سیر کر کے کچھ کام
دروازے کا مٹھ کہ دیدہ وا تھا | توبہ کا در کھلا ہوا تھا
آیا تو وہ کب سے تکتی تھی راہ | دیکھا تو کہا کہاں رہے واہ
دیکھے جو حنائی ہاتھ بے لاگ | تلووں سے بری کے لگ گئی آگ
پوچھا کہ بن آئی کس بنی کی | کس راہ کی زن نے رہزنی کی
توفیق یہاں تلک جو لاتی | مہندی پاؤں کی گھس نہ جاتی
قدموں سے لگا پسا ہوا وہ | مہندی کا جو رنگ تھا کہا وہ
رانی کی وہ مہر و سر گرانی | راجا کی وہ قہر و حکم رانی
من بیچتے اپنا قید ہونا | داموں کے لئے وہ صید ہونا
چتراوت کا وہ آپ آنا | سب کہکے کہا خدا ہے دانا
شادی نہیں کچھ خوشی سے مانی | بے تیرے تھی مرگ زندگانی
غم تھا کہ ترے قدم سے چھوٹا | شادی کے بہانے غم سے چھوٹا
بیاری یہ نہیں حنائی چنگال | ہاتھ ایسے ملے کہ ہو گئے لال
زنجیروں سے پاؤں ہے نکالا | زلفوں پہ نہیں یہ ہاتھ ڈالا
کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں | چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں
بگڑی وہ کہ چل بنا نہ باتیں | مجھ سے کوئی سیکھے ایسی گھاتیں

مہری تجھے ایسی کیا لگی تھی
تلووں سے تیرے حنا لگی تھی

تنگ آیا تو دیکھ قید خانا
آسان نہیں کڑی اٹھانا

پتھر کی اگر کہو تو میں ہوں
فولاد جگر کہو تو میں ہوں

سہتی ہوں جہاں کی سختی سستی
آسائش جان تندرستی

اس تنگ قفس کو سمجھی ہوں باغ
سنگینی گراں نہ جلنے کا داغ

قسمت سے مقر ہے اب نہ مامن
پتھر کے تلے دبا ہے دامن

کب چاہے گی عقل مصلحت سنج
تم تو کرو شادی ہم کریں رنج

راضی ہیں خدا کی جو رضا ہو
ہوتی ہے سحر چلو ہوا ہو

وہ معتقد اس کے پاؤں چھو کر
اٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر

آیا تو وہ نوعروس زیبا
بستر پہ تھی شکل نقش دیبا

نیند آئی جو تھی بصد کدورت
تھی چیں بجبیں شکن کی صورت

سوئی تو تھی انتظار میں وہ
جاگی تو ملا کنار میں وہ

سوتے جو کٹی شبِ جوانی
سو خفتہ نصیبی اپنی جاگی

تھے صبح سے دونوں شام جویاں
شب کو ہوئے داخل شبستاں

دونوں تھے تصوروں میں کامل
خلوت خانہ تھا گوشۂ دل

دو آنکھوں کی طرح ایک جا تھے
پر دل جو ملا نہ تھا جدا تھے

کروٹ لے کر وہ عنبریں مو
اُٹھ چلنے کا سوچتا تھا پہلو

. . . .

حیرت چھائی تو کھو گئی وہ
غفلت آئی تو سو گئی وہ

غافل اُسے چھوڑ کر اٹھا یہ — لپکا تو پری کے رُخ گیا یہ

یہ جاگے ہوئی وہ فتنہ بیدار — دیکھا تو تھا تکیہ جائے دلدار

دوری نے جو حد سے کی درازی — جانا کہ کہیں ہے عشق بازی

اس رات کو چپکی ہو رہی وہ — کل سمجھونگی کہہ کے سو رہی وہ

وقتِ سحر اس کو پا کے رانی — ہم بسترِ خوابِ سرگرانی

خلوت خانے سے باہر آئی — دربانوں کے پاس در پر آئی

حکم اُن کو دیا کہ شام کو آج — جانا ہمراہ صاحبِ تاج

سائے کی طرح سے ساتھ رہنا — جو آنکھ سے دیکھنا وہ کہنا

جس وقت چلا پری کا مانوس — سایہ سے بسِ قدم تھے جاسوس

وہ مٹھ وہ پری مقام دیکھا — وہ برج وہ مہ تمام دیکھا

اک ان میں سے رانی پاس آیا — کی عرض کہ لو سُراغ پایا

صورت یہ ہے جو نگاہ کی ہے — اک مٹھ میں مورت اک پری ہے

آنکھوں سے اُس انجمن کو دیکھا — یکجا بُت و برہمن کو دیکھا

لعل و گہر ایک دُرج میں ہے — شمس و قمر ایک بُرج میں ہے

آنکھ اس کی یہ سن کے خوں میں ڈوبی — مریخ بنی وہ ماہ خوبی

یہاں اس نے کہا وہ برج کھدواؤ — وہاں بولی بکاؤلی کہ لو جاؤ

یہاں سے چلے لوگ ان سے وہ زار — لپکا یہ ادھر اُدھر وہ خونخوار

توڑا وہ مٹھ حباب آسا — پھوڑا جلے دل کا آبلہ سا

شہزادے کے آگے بے حیا نے — الغام دیا کھلے خزانے

پاس اس کا ذرا نہیں کیا کچھ — اور اس سے کہا کہ تو سُنا کچھ
بنیاد فساد کھود ڈالی — جاسوسوں نے کھود کر نکالی
غائب رہتے تھے روز شب بھر — اب دیکھو گے جا کے خاک پتھر
سنتے ہی وہ بیقرار لپکا — دوڑا بے اختیار لپکا
دیکھا تو وہ ماہرو نہ وہ بُرج — وہ لعل گراں بہا نہ وہ دُرج
شور اس نے کیا کہ کیا یہ شر ہے — آواز آئی کہ بے خبر ہے
بنیاد برافگنی کی بانی — ہے سوت مری وہ تیری رانی
کھدوایا جب اُس نے منھ بصد جور — رہنے کو ملا ہمیں مکان اور
واں ٹھوکریں کھائی سخت تھیں تنگ — سنگست بجائے خویشتن سنگ
ہونا تھا یہی تو شکوہ کیا ہے — جا کچھ دنوں صبر کر خدا ہے
حیرت زدہ چپ خموش سنسان — ٹوٹا ہوا دل بندھا ہوا دھیان
آیا تو ہنسی وہ شوخ رانی — گویا وہ ہوا بخوش بیانی
تقدیر کو گل کھلانا تھا یوں — تو خار سے بیخ کن ہوئی کیوں
دوراں کو تھا انقلاب منظور — مختار خدا ہے بندہ مجبور

.... — ....
.... — ....

پیدا ہونا بکاؤلی کا دہقان کے گھر میں اور جوان ہو کر ملنا تاج الملوک سے

نقطوں سے ہے اب قلم کا دہقاں — صفحے کی زمیں پہ دانہ افشاں

جب مٹھ کی رہی نہ بیخ و بنیاد	جیسے کہ ہو گرد باد برباد
دہقاں تھے نئی زمیں کے جویا	سرسوں کا کھیت انھوں نے بویا
جب چین سے کر چکے تردد	کھیتی کی ہوئی زمیں پہ واشد
دہقان کی زوجہ کے کھلے بھاگ	کھانے لگی نوچ نوچ کے ساگ
کھاتے ہی حمل کا ڈھنگ پایا	سرسوں سا ہتھیلی پر جمایا
وہ بانجھ تھی جب حمل قبولی	سرسوں آنکھوں میں سب کے پھولی
ایام مقرری گزر کر	پیدا ہوئی اک حسینہ دختر
صورت میں پری جمال میں حور	فلفل سی وہ ماں تھی بیش کافور
مشہور ہوئی وہ ماہ پارہ	لوگ آنے لگے پئے نظارہ
وہ منتظر ظہورِ نیرنگ	یعنی تاج الملوک دل تنگ
پھر جا سن کر چلا کہ دیکھوں	دیکھا تو کھبا نظر میں افسوں
جانا کہ پری وہ سوختہ تن	سانچے میں سے ڈھلکے نکلی کندن
چہرے سے پری کا ڈھنگ پایا	اندر کا وہ قول یاد آیا
دہقاں سے کہا کہ سیم و زر لے	دولت صدقے یہ سیمبر دے
دہقاں نے کہا کہ میرے صاحب	یہ باتیں تمھیں نہیں مناسب
دختر جو پسند مہ لقا ہے	بکتی نہیں لعل بے بہا ہے
پھل سے نہیں پیڑ کو سروکار	جب تک کہ ہو کام کا نہیں بار

....

یہ سوچ کے گھر پھرا وہ دل سوز	آیا کیا اس کو دیکھنے روز

دن دن اسے ہو گیا قیامت — بوٹا سی بڑھی وہ سروِ قامت
چلتی تو زمیں میں سرو گڑتے — باتیں کرتی تو پھول جھڑتے
خواہاں ہوئے ہم وقار ان کے — دہقاں ہوئے خواستگار اُس کے
کہہ بے سروبرگی اپنی دہقاں — بولا کہ ہے رب کے ہاتھ ساماں
شہزادے نے ایک دن پھر آکر — شادی کو کہا حیا اٹھا کر
دہقاں نے کہا کہ یا شہنشاہ — تم کوہِ وقار میں پرکاہ
صحبت ہے برابری میں زیبا — نسبت ہے برادری میں زیبا
دہقاں زادی وہ بے محابا — بول اٹھی کس آن سے کہ بابا
خواہاں سے مرے نہ ہو تو ناخوش — ہے دخترِ رز نصیب میکش
مطلب کو سمجھ کے گھر پھرا وہ — وقت آنے کا منتظر رہا وہ
یہاں تو یہ حساب کرتا تھا سن — وہاں لوگ ارم کے گنتے تھے دن
گزرا بارے جو عہدِ سختی — آئے ایامِ نیک بختی
دختر وہ پکڑ کے باپ کا ہاتھ — پچھواڑے مکاں کے لے گئی ساتھ
وہاں تھا کسی وقت کا دفینہ — دکھلا کے کہا یہ لے خزینہ
کہنا نہ کسی سے میں پری ہوں — تو کیا جانے بکاؤلی ہوں
ایک آدمی زاد کی بدولت — لائی ترے گھر ہے مجھ کو قسمت
ناگاہ سمن بری لئے تخت — وارد ہوئی اور کہا کہ لے رخت
رخت اس نے بھیجکے تخت اُڑایا — دامانِ نظر سے مُنہ چھپایا
چتراوت کا محل جدھر تھا — سوتا جس رخ وہ سیمبر تھا
واں جا کے ہوئی وہ نور آگیں — پروانے کی اپنے شمع بالیں

بیدار کیا وہ ماہ پیکر — جاگا تو تھا آفتاب سر پر
اٹھا جو وہ کہہ کے آؤ جانی — آواز سے چونک اٹھی وہ رانی
منہ دیکھتے ہی بکاؤلی کا — سایہ اُسے ہو گیا پری کا
بولی وہ بکاؤلی سیانی — ہے سوت مری یہی وہ رانی
بلاؤ وہ کہ لونڈی ہے تمہاری — یہ کہکے اُسے کہا کہ پیاری
چوٹی ہے مری تو ہاتھ ان کے — چل آ کہ چلا میں ساتھ ان کے
رانی نے کہا کہ گو یہ ہے غیر — میں تیری ہوں تو کسی کا ہو خیر
یہ بات بکاؤلی کو بھائی — شہزادے کے ساتھ اسے بھی لائی
اُڑتے ہی وہ تخت سحر آگیں — کیا دور تھا گلشن نگاریں
مدت کے جو بعد گھر میں آئے — کھوئے ہوئے جیسے سب نے پائے
فردوس کی بیسوا وہ دلبر — محمودہ دیونی کی دختر
چتراوت چترسین کی جان — آرام ارم بکاؤلی جان
ان چاروں میں ایک مست بادہ — پورب کا بادشاہزادہ
یا پانچوں سر پنجۂ وفا تھے — یا خمسۂ مطلع صفا تھے
ہوتے ہی حواس خمسہ مجموع — آمد ہوئی اقربا کی مسموع
فیروز شہ و جمیلہ دانا — حسن آرا اور روح افزا
پورب کا وہ شاہ شاہ بانو — اطراف سے مملکت کے میں تو
جو جو آیا بلا تکلف — اک قافلہ سے ملا وہ یوسف
سلطانوں کی قدر دانیاں کیں — مہمانوں کی میزبانیاں کیں

چند بے رہا مجمع بد و نیک — رخصت ہوئے رفتہ رفتہ اک ایک
روح افزا سے بکاؤلی کو — الفت تھی جورو کا دل لگی کو
رکنا ہوا اس پری کا مشکل — یہ دل لگی اب لگائے گی دل

عاشق ہونا بہرام وزیرزادہ تاج الملوک کا روح افزا پری پر اور شادی ہونا بکاؤلی کی سعی سے اور کامیاب رہنا

جب ختم یہ داستان آئی — یوں شاخِ قلم شگوفہ لائی
روح افزا کو بکاؤلی نے — روکا جو یہاں لگی بہلنے
یک شب کہ وہ زلف مہ رخاں تھی — یا آتشِ مہر کا دخاں تھی
وہ مست مئے فسانہ گوئی — مہتابی پہ چاندنی سی سوئی
سلطاں کا وزیر زادہ بہرام — گلگشت چمن میں تھا گل اندام
ٹک لی دیکھی پری کی چوٹی — ناگن سی اس کے دل پہ لوٹی
کھٹکے سے مگر بکاؤلی کے — کھاگا سایے سے اُس پری کے
جب کاکلِ شب سے روئے خورشید — تاباں ہوا مہرِ چشمِ امید
دیکھا تو ماہ نو کا تھا برج — رکھتا تھا ڈر یگانہ وہ درج
بیتابی نے کچھ قرار پایا — مجبوری میں کچھ اختیار پایا
مہتابی پہ چاندنی جب آئی — سایے نے پری پہ کی چڑھائی
اُس فتنہ کی خواب گہ تک آیا — مانندِ سہا وہ مہ تک آیا

تجویز رہا تھا گھات گونگی | ناگاہ وہ مست خواب چونکی
آغوش کی موج سے وہ مضطر | مچھلی سی نکل گئی تڑپ کر
پیچھا کیے صحن تک وہ آیا | مہتاب کے پیچھے جیسے سایہ
ملتی اُسے خاک وہ ہوائی | انساں کو پری نہ ہاتھ آئی
ہوتے ہی سحر وہ روح افزا | رخصت ہوئی گھر کو رکھ کے پردا
معشوق سے رہ گیا جو ناکام | تھا غم سے کنار گور بہرام
تنہا وہ سمن پری تھی اک روز | قدموں پہ گرا کہا بصد سوز
دل سے ہوں فدائے روح افزا | مرتا ہوں برائے روح افزا
بولی وہ ارے بشر سڑی ہے | روح افزا کیا بکاؤلی ہے
شہزادے کے ڈھنگ پر نہ تو چل | ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل
بولا وہ کہ مجھ سے اس سے ہے راہ | شبنم کی ہے آفتاب کو چاہ
واقف تھی پری کے دیس سے وہ | لے پہنچی زنانے بھیس سے وہ
فردوس میں مالن ایک تھی حور | گلچہرہ پری بنفشہ مشہور
پوشیدہ گھر اس کے لائی اس کو | منہ بولی بہن بتائی اُس کو
فردوس کی سیر کے بہانے | چھوڑا منزل پہ رہ نمانے
روح افزا کے لئے بنفشہ | گلدستہ بنائی تھی ہمیشہ
حاجت کو ذرا گئی جو باہر | بہرام نے پشت آئینہ پر
تحریر کیا کہ بے مروت | آئینہ ہے تجھ پہ میری صورت
افسوس مجھے تو آرزو ہو | اور آئینہ تیرے روبرو ہو

لیکن تو زبسکہ خود نما ہے
خود بینی سے جو کرے بجا ہے

یہ لکھ کے ہٹا تو مالن آئی
گلدستہ پری کے پاس لائی

روح افزا کا سنگار کر کے
محو اس کی ہوئی جو پیار کر کے

الٹا اسے آئینہ دکھایا
خط سمجھی وہ کاکلوں کا سایا

مضمون جو بڑھا پری تھی دانا
نقش عمل نگار جانا

ماشطہ کو دیکھکر اکیلی
بولی کہ بتاؤ یہ پہیلی

ہاتھ آکر جو نہ پائے وہ کون
ہو کر جو نظر نہ آئے وہ کون

سوچی تو نہ بوجھی وہ کہا کل
کہدوں گی یہ کہہ کے آئی بیکل

بہرام اس سوچ کو سمجھ کر
بولا کیا ہے کہا الجھ کر

وہ جانتا تھا نہ اس کو سوجھی
بولا لو بات کیا ہے بوجھی

ہاتھ آکے نہ پائے جو وہ مجذوب
ہو کر نہ دکھائی دے وہ محبوب

وہ سن کے جو دوسرے دن آئی
تقریر سنی ہوئی سنائی

سمجھی وہ کہ پوچھ آئی ہے یہ
پوچھا کس نے بتائی ہے یہ

بولی وہ کہ ہاں مجھے نہ سوجھی
منہ بولی بہن نے میری بوجھی

روح افزا نے کہا کہ ناداں
ہمراہ اسے کیوں نہ لائی تو یاں

بولی وہ ابھی چلی میں لائی
جا کر طلبی اسے سنائی

اس مژدہ کا منتظر ہی تھا وہ
ساتھ اس کے زنانے میں گیا وہ

امرد کا لباس تھا زنانا
دھوکا کچھ کھا گئی وہ دانا

پوچھا کہو نام کیا۔ کہا ننگ
پوچھا کہ نشاں، کہا دل تنگ

یہ سُنکے اشارے سے بٹھایا — بادام بنفشہ کو دکھایا

وہ سمجھی کہا یہ پردہ پوشی — گندم کے بہانے جَو فروشی

بہرام ہے تو ارے نہی چور — رہ تجھ کو بناؤں سحر سے گور

بدبین سمجھ کے گور کا نام — پنجرہ اک لائی وہ گل اندام

طوق اُس کو طلسم کا پنہایا — قمری اُسے سحر نے بنایا

دن بھر تو وہ فاختہ پڑھاتی — شب کو اُسے آدمی بناتی

غماز تھی ایک خواص اس کی — دمساز تھی وقت خاص اُسکی

اک دن پنجرا اُٹھا کے لائی — حسن آرا کو وہ گل سجھائی

کھولا جو وہ بند سحر بنیاد — دیکھا تو مجسم آدمی زاد

گستاخ جو اس بشر کو پایا — غصہ غضب اس پری کو آیا

لوگوں سے کہا ہٹاؤ اس کو — آتشکدے میں جلاؤ اس کو

لوگ اس کو لے چلے جلانے — تقدیر کے سُنیے کارخانے

شہزادہ بکاؤلی کے ہمراہ — گزرا اسی راستے سے ناگاہ

دیکھا تو وزیرزادہ بہرام — ہوتے ہیں تھا شکل نقرۂ خام

جلنے سے پناہ دے کے اُسکو — فردوس میں آئے لیکے اُسکو

زندہ اُسے پا کے حسن آرا — بولی کہ یہ چور ہے ہمارا

قابل ہے جلانے کے یہ فاسق — روح افزا کا ہوا ہے عاشق

بولی وہ بکاؤلی کہ قربان — یہ کون سی فہم ہے پچی جان

پیارے کا جو اپنے ہو پیارا — کیونکر ستم اُس پہ ہو گوارا

حسن آرا نے کہا بجا ہے
تم کیوں نہ کہو کہ خود کیا ہے
بولی وہ کہ پھر عبث ہے انکار
جب نہ تھا تو اب ہے کیا عار
کیا کہتی وہ دم بخود تھا کی
سوچی سمجھی رضا خدا کی
مرسوم تھے جس طرح کے انداز
شادی کا خوشی خوشی کیا ساز

شادی جو ہوئی تو غم ہوا دور
فردوس سے گھر کو آئی وہ حور
گلزار جو اہریں ہیں آکر
آباد ہوئی وہ یاسمن بر
حاصل ہوئی ان گلوں کو بیخار
سیر شب زلف صبح رخسار
جس طرح انھیں بہم ملایا
بچھڑے ہوئے سب ملیں خدایا

تاریخ اختتام تصنیف از مصنّف

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد
توقیع قبول روزیش باد

۱۲۵۴ھ

فرہنگ الفاظ

۷۸۶

فرہنگ الفاظ

۱- حمد

الفاظ	معنی
شگوفہ	کلی
شگوفہ کاری	پھول نکلنا
ثمرہ	پھل
باری	خداوند تعالیٰ
دوزباں	قلم کے دو حصے جو شگاف رکھنے سے ہو جاتے ہیں۔
یکسر	برابر
حق	خدا
مدحت	تعریف
حرف زن	باتیں کرنے والا یا باتیں بنانے والا
پنجتن	حضرت محمدؐ حضرت علیؓ حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ حضرت فاطمہؓ
سخن پرستی	شاعری
پیشدستی	پہل کرنا۔

۲- خواستگاری جناب باری سے مثنوی گلزار کی ترتیب کے واسطے

الفاظ	معنی
یارب	اے خدا
خامہ	قلم
منقار	چونچ
ہزار داستان	بلبل
بکاؤلی	ایک پری شہزادی کا نام
افسوں	جادو

الفاظ	معنی
سخن گو	بات کہنے والا
نثر	بکھرا ہوا۔ پریشان
نظم	اشعار۔ موتی کا پرونا
داد	تعریف۔ بیان کرنا
مے	شراب
دو آتشہ	دو بار کھینچی ہوئی تیز شراب
قلمرو	سلطنت۔ بادشاہت
فروغ	روشنی
فروغ پانا	سبقت لیجانا
بحر	سمندر
باقی	قائم
ساقی	شراب یا پانی پلانے والا
نکتہ چیں	اعتراض کرنے والا
اہل قلم	صاحب قلم۔ منشی
نوک رکھ لینا	عزت قائم رکھنا
تسخیر کرنا	مطیع کرنا
نیرنگ	جادو
طلسم	جادو

الفاظ	معنی
سپند	ایک کالا دانہ جو جادو وغیرہ کا اثر اتارنے کے لئے جلایا جاتا ہے۔
جدول	حاشیہ
حصار	حد، دائرہ۔ گھیرا۔
سحر خوانی	افسوں پڑھنا
نکتہ	بات۔ باریک مطلب۔
حرف نغز آئے	اعتراض نہ ہو
مرکز	مطلب

۳۔ داستان تاج الملوک شاہزادہ اور زین الملوک بادشاہ مشرق کی

الفاظ	معنی
روداد	واقعہ۔ بیان
باستان	قدیم۔ پرانا۔
زماں باستانی	پچھلے زمانہ والی
ذی جاہ	رتبہ والا
زین الملوک	بادشاہ کا نام

الفاظ	معنی
لشکرکش	چڑھائی کرنے والا
کُش	مارنے والا
شہریار	بادشاہ
خالق	پیدا کرنے والا
خردمند	عقل مند
نقشہ جمانا	صورت پیدا کرنا
پیش خیمہ	آثار
پس ماندہ	جو پیچھے رہ جائے۔
نخل	درخت
بار	پھل
حمل	بوجھ
مہر	آفتاب
انور	روشن
رُخ	چہرہ
چشمک	حسد ۔ رنجش۔
مہ جبیں	چاند کی سی پیشانی
ستارہ بیں	نجومی ۔ جو لوگ ستاروں کو دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے ہیں

الفاظ	معنی
سرشک	آنسو
دیدہ تر	آنسو بھری آنکھ
گلفام	پھول کی طرح حسین نازک
نام خدا	خدا کے واسطے
صاد	تصدیق ۔ اقرار۔
بصر	بینائی
چشم پوشی کرنا	نظر انداز کرنا۔ چھپا لینا۔
نورِ بصر	آنکھوں کا نور مراد بیٹا۔
رونمائی	منہ دکھائی
کور	اندھا
طور	ایک پہاڑ کا نام ۔ جس پر حضرت موسیٰ کو اللہ کا جلوہ نظر آیا تھا۔
بینا	دیکھنے والا
مختار	مالک

ہمرہ جانا چاروں شہزادوں کا
یہ تجویز کرنا حال تلاشِ گل بکاؤلی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
صفحہ		صفحہ	

الفاظ	معنی
میل	سرمہ کی سلائی
میل قلم	مراد قلم
کحال	آنکھ کا معالج
پیر	بڈھا
دیرین	پُرانا
کراہا	افسوس کیا (یہ محاورہ اب متروک ہے)
چنگل مارنا	حاصل کرنا
مہر گیا	ایک قسم کی گھاس جس کو اپنے پاس رکھنے سے دشمن بھی مہربان ہو جاتا ہے۔
ارم	جنّت
چار ناچار	مجبوراً
خرگاہ	خیمہ
بادیا گرد	جنگل میں گھومنے والا۔ صحرا نورد۔
خانہ برباد	جس کا گھر اجڑ گیا ہو۔
خاک اڑانا	پریشان پھرنا۔

الفاظ	معنی
خیل	بھیڑ۔ جھنڈ
سیل	سیلاب۔ طوفان
شہ زور	طاقت ور۔
ہوا	آرزو
اختر	ستارہ
نیک اختر	خوش قسمت

۵۔ غلام ہونا چاروں شہزادوں کا چوسر کھیل کر دلبر بیسوا سے

الفاظ	معنی
مہرہ	پانسہ
مہرہ بازی	شعبدہ بازی۔ پانسہ پھینکنا۔ چالاکی۔
بدطرازی	بری طبیعت
یک چند	کچھ دیر
انبوہ	بھیڑ
صحرا	جنگل
وارد ہونا	اُترنا
جویا	تلاش کرنے والا۔

الفاظ	معنی
بیسوا	طوائف
لگا کے لانا	لبھا کر اپنے ساتھ لے آنا
چوسر	ایک کھیل کا نام
ہتھکنڈا	داؤں پیچ
قسمت آسا	قسمت کی طرح
پاسا	شطرنجی
موش	چوہا
بندی	قیدی
کھلاڑ	کھیلنے والی لیکن محاورہ ہیں بازاری عورت کو بھی کہتے ہیں۔
نردوں	چوسر کی گوٹ
پو، جگ	چوسر کی اصطلاحیں ہیں۔

الفاظ	معنی
دلگیر	رنجیدہ
خواری	ذلت
جُل دینا	دھوکا دینا
زچ کرنا	عاجز کر دینا اور شطرنج کی ایک اصطلاح بھی ہے۔
خودکام	خود غرضی
اندھیر	غضب
ڈنکے کی چوٹ	کھلم کھلا
کھیل کھانا	ناجائز طریقے سے آمدنی حاصل کرنا
مارِ آستین	آستین کا سانپ۔ دوست نما دشمن۔
چراغ پا	ناراض ہونا۔
خضر	وہ پیغمبر جو بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتے ہیں۔
غول	بھوت۔ پریت
چراغی لینا	تابع کرنا۔ نذر لینا۔
بہرہ آنا	کامیابی

۶۔ جیتا تاج الملوک کا دلبر بیسوا
کو اور چھوڑ کر روانہ ہوا تلاش
گل بکاؤلی ہیں

الفاظ	معنی
زرِ گل	پھول کا ریزہ

الفاظ	معنی
راجہ نل	سندھ کا ایک راجہ جس نے جوئے میں سلطنت ہار دی تھی
عدول	انکار
چندے	تھوڑے عرصہ تک
دل پر رکھنا	پکا ارادہ کرنا
پامردی	بہادری
لات مارنا	کسی چیز کو چھوڑ دینا
جز	سوائے
اللہ کے نام	اللہ کے بھروسہ پر

پہنچنا تاج الملوک کا سرنگ کھود کر باغ میں بکاؤلی کے اور گل لے کر بھاگنا

الفاظ	معنی
سواد	سیاہی
جہاں گرد	دنیا کا گھومنے والا
گرد	بے کار۔ بے حقیقت

الفاظ	معنی
صحرائے عدم	نیستی کا جنگل۔ موت
عنقا	ایک پرندہ جس کو کسی نے دیکھا نہیں معنی نایاب
کفِ پا	تلوا
ریگ ماہی	ایک مچھلی جو ریت میں رہتی ہے۔
تگ و دو	دوڑ دھوپ۔ محنت۔
رہرو	مسافر
ڈانڈا	سرحد۔ حد۔
بلا کا	غضب کا
گورکن	قبر کھودنے والا
رہِ عدم	عدم کا راستہ۔ موت
بے رگ و ریشہ	بے رگ و ریشہ
حلوائے دود	شیریں میوے۔ نہایت خوش ذائقہ۔ چونکہ وہ سورج کی گرمی سے پکتے ہیں اور آگ کا دھواں ان کو نہیں پہنچتا۔
اشتر	اونٹ
آرد	آٹا
روغن	گھی۔ چکنائی۔

الفاظ	معنی
لوتھ	لاش
باربردوش	کندھے پر بوجھ لادے ہوئے
کارواں	قافلہ
کڑوا	سخت۔ تند مزاج
گلبن	پھول کی طرح
اژدر	اژدھا
اخگر	چنگاری
ریو	شک۔ دھوکہ
زنبور	شہد کی مکھی
انگبیں	شہد
مجہول	پاگل۔ دیوانہ
نرگس	نرگس آنکھ سے مشابہ ہوتی ہے مگر بینائی سے محروم۔ تاج الملوک کے باپ کی بے نور آنکھوں کو نرگس سے تشبیہ دی ہے
ایوان	محل
ساعی	کوشش کرنے والا
جامِ جہاں نما	جمشید کا پیالہ جس سے تمام دنیا کے حالات معلوم ہوتے تھے۔

الفاظ	معنی
ایاغ	شراب کا پیالہ۔ پھول کو پیالے سے تشبیہ دی ہے
ستون	کھمبا
ساعد	کلائی
مژگان	پلک
مخمور	متوالا
حجاب	پردہ
محرم	کُرتی
لٹ	لمبے بال
کالے	مراد سانپ
شتاباں	جلدی سے
دستِ بیضا	حضرت موسیٰ کا معجزہ تھا کہ آپ کا ایک ہاتھ روشن تھا چمکتا ہوا روشن ہاتھ۔
رخنہ بندی	راستہ بند کرنا
انگشتری	انگوٹھی

۸۔ آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

الفاظ	معنی
الم	غم
نغمہ زن	چہکنا
غنچہ	کلی
اندام	جسم
نکہت	خوشبو
جُل دینا	دھوکہ دینا
خار دینا	غم میں مبتلا کرنا
تازیانہ	کوڑا
نرگس، سوسن، سنبل، شمشاد	یہ سب بکاولی کی خواصوں کے نام ہیں۔ پھولدار پیڑوں کے نام
خواص	لونڈی
زباں درازی کرنا	سخت سست کہنا۔ برا کہنا
بیگانہ	غیر
چراغ گل ہونا	برباد ہو جانا
اوس پڑ جانا	برباد ہو جانا
منھ سے پھوٹنا	آواز نکالنا
ہوا بتانا	بہانہ کرنا

الفاظ	معنی
راست ہو بر اندام	جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جانا
ہاتھ ملنا	افسوس کرنا
گل برگ	گلاب کی پتی
دستاویز	تحریری ثبوت
دست برد	قابو۔ پہنچ
ہیہات	افسوس
غبار	غصہ
گلچین	پھول توڑنے والا
تختہ	پھولوں کی جھاڑی

۹ پہنچنا تاج الملوک کا ایک اندھے فقیر کے تکیے پر اور آزمانا گل کا

الفاظ	معنی
مدعا	مطلب
حق بیں	حق کا دیکھنے والا
ہمقدم	مانند

الفاظ	معنی
جھوٹوں	جھوٹ موٹ
تانا	آزمانا
سچوں	سچ مچ
داغ کھانا	داغ لگایا جانا۔ قیدی ہونے کی علامت
تفنگ	بندوق
افتاد	مصیبت
پوربی۔ جوگیا	راگنوں کے نام ہیں۔
جنگلہ۔ دیس	راگنیاں جو نگہ جوگی اکثر بجاتے ہیں اس کی بھی رعایت رکھی ہے۔
چراغاں	روشنی

۱۰۔ ملنا چاروں شہزادوں کا اور چھن جانا گل بکاؤلی کا

الفاظ	معنی
چرخ	آسمان

الفاظ	معنی
جور	ظلم
غول	بھوت
بادہوائی	فضول۔ بے کار
پھول پھول کر	خوش ہو ہو کر
گل زمین	کاشت کی جگہ
چوبائی ہوا	چوطرفہ ہوا۔ چار بھائیوں کی رعایت سے کہی ہے
مفت بر	بے محنت کے لینے والا۔ لٹیرا۔
راستہ بتانا	دھتکار دینا۔
ہوا کا گھوڑا	جلدی سے
تعجیل	جلدی سے
آب رفتہ	جو پانی بہہ گیا ہو
جو	نہر
بصر	بینائی
تونگر	مالدار
طرب	خوشی
شادیانے	خوشی کے گیت

الفاظ	معنی

۱۱- پہنچنا بکاؤلی کا دارالخلافت زین الملوک میں

الفاظ	معنی
گل کھلنا	نئی بات پیدا کرنا۔
گلبانگ لے ماں	نغمے گانا
بطون	راز پوشیدہ
طالع	قسمت
شگون	فال

۱۲- آباد ہونا تاج الملوک کا گلشن نگارین ہوا کے

الفاظ	معنی
بیت	گھر
عازم	ارادہ کرنے والا
چمن چمن ہونا	خوش ہونا
خوشی خدا کی	مرضی خدا کی

الفاظ	معنی
بال باندھی آئی	فرمانبرداری کیساتھ آئی
صنّاع	کاریگر
طلسم کار	جادوگر
سمن بر، نسرین بدن	خوبصورت
قلاش	مفلس
خوش باش	خوشحال لوگ
تاجر	سوداگر

۱۳- ملاقات ہونا زین الملوک اور تاج الملوک کی آپس میں

الفاظ	معنی
مہ لقا	حسین
قوت	روزی
من	ایک قیمتی ہیرا ہوتا ہے جو اژدھے کے پیٹ سے نکلتا ہے یہاں لعل کو من کہا ہے۔

الفاظ	معنی
شحنہ	کوتوال
تبر	کلہاڑی
قارون	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک نہایت مالدار شخص تھا جس نے جنت بنائی تھی۔
نیرنگ و فسوں	جادو

١٤۔ حکایت ایک عورت کے مرد بن جانے کی

الفاظ	معنی
بارور زوج	حاملہ بیوی
بداختر	بدنصیب
اوج	بلندی
راس	زائچہ - نجوم
کنیاراس	ناکام کو کہتے ہیں۔ کنیا لڑکی کو کہتے ہیں اور راس ایک برج کا نام ہے

الفاظ	معنی
ساز	سازش - میں
بدیمن	منحوس
گندم نما جو فروش	جس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ
بالی	کم سن لڑکی
جویا	تلاش کرنے والا
سوگند	قسم
پرتو	عکس - سایہ

١٥۔ حکایت نصیحت گری مرغ اسیر اور نافہمی صیاد کی

الفاظ	معنی
مرغ	پرند
اسیر	قیدی
صیاد	شکاری
طائر	چڑیا
بن داموں غلام ہونا	گرویدہ ہونا

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
پر لگانا	اڑنا	قوی بال	قوی بازو والی
شکم	پیٹ	ہم چشم	برابر والے
دلاسا	تشفی	خیابان	چمن۔ کیاریاں
لاسا	ایک لیسدار مسالہ جس سے چڑیوں کو پکڑتے ہیں۔	خسک	کانٹے۔ گوکھرو۔
باور	یقین	تاراج	برباد
دہل	خوف	الوان	رنگ (واحد لون)
مسطور	اوپر لکھا ہوا	کوکا	دودھ شریک بھائی
رفع شر	برائی کو دور کرنا	طفل	آنسوؤں کو بھی کہتے ہیں
جبہہ	پیشانی	خویش و بیگانہ	عزیز۔ احباب
قران	میل۔ نزدیکی		
تا فردا	کل تک		
نگار خانہ	تصویروں کا گھر		

۱۵۔ غائب ہو جانا فرخ یعنی بکاؤلی کا اور بلوانا تاج الملوک کو

۱۶۔ بھید کھلنا چھپے ہوؤں کا ایک ایک پر

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
واشگاف	کھولنا	دستور	وزیر
		مستور	چھپی ہوئی
		پر و بال نکالنا	تدبیر کرنا
		دلا	اے دل

الفاظ	معنی
شتاب	جلدی
غربت	پردیس
منکوب	بدحالی۔ پریشان حال
دلبر دلبراں	معشوق
روبرو نہاد	نظر سامنے کرنا
سنگ خارہ	سخت پتھر
اخوان	بھائی
جادو سر پر چڑھکر بولنا	اپنا راز خود فاش کرنا
سبز باغ دکھانا	کسی چیز کا لالچ دینا
کانٹوں میں الجھنا	مصیبت میں پڑنا
القط	بس کرنا۔ علیحدہ ہونا۔
ہوائی	اڑنے والی
حورش	حور کی شکل
گلگشت	چہل قدمی کرنا
کبک	چکور
سرمہ کھانا	سرمہ کھانے سے آدمی گونگا ہوجاتا ہے۔

الفاظ	معنی
عنبریں	خوشبو
بدی ہونا	قسمت میں لکھا ہونا
سانس پانا	موقع پانا
برق دماں	خوفناک بجلی
یم	دریا

۱۸۔ افشائے راز ہو کر پھنسنا تاج الملوک کا طلسم میں

الفاظ	معنی
خونی رقمی	سرخ تحریر
کلک شنجرف	شنجرفی قلم
سرکش	پردہ کھولنے والا۔ راز ظاہر کرنے والا
غماز	چغلی کھانے والا
کاٹو تو لہو نہ تھا	بہت خوفزدہ ہونا
چنگال	پنجہ
خام پارہ	آوارہ عورت

الفاظ	معنی
خجالت	شرمندگی
زمین میں گڑنا	بہت شرمندہ ہونا

۱۹۔ پابزنجیر ہونا بکاؤلی کا سودائے فراق تاج الملوک میں

الفاظ	معنی
فانوس خیال	کاغذ کی قندیل جس کے اندر ہاتھی گھوڑے وغیرہ چکر لگا دیتے ہیں۔ اس کو "دورِ شکارگاہ" بھی کہتے ہیں
چاند کو گہن لگنا	مصیبت میں مبتلا ہونا۔
سمندر	ایک کیڑا جو آگ میں رہتا ہے۔
محبوس	قید
سایہ	آسیب
چہ ذقن	ٹھوڑی کا گڑھا
باؤلی	کنواں

۲۰۔ آنا تاج الملوک کا صحرائے طلسم سے

الفاظ	معنی
اخلاص	خلوص
خامہ غواص	غوطہ لگانے والا قلم
افسر	تاج
دوب	گھاس
گلخن	انگیٹھی
اخگر	شعلہ
بہرہ مارا	کامیابی حاصل کی
طوبیٰ	جنت کا ایک درخت
جراحت	زخم
ملہم غیب	غیب کی خبر پہنچانے والا
سیاہی کرنا	ظاہر ہونا (فارسی کا فقرہ ہے سیاہی زدن)
عصافیر	ابابیلیں (اس کا واحد عصفور ہے)

الفاظ	معنی
پراں	اڑنا
امید سے رہنا	حاملہ ہونا
کوہ البرز	ماژندران کے ایک پہاڑ کا نام۔ کوہ قاف کی ایک چوٹی کا نام
جی چھانا	ہمت پست کرنا۔ رنجیدہ ہونا
موسیٰ کا عصا	حضرت موسیٰ کی لاٹھی میں یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ زمین پر چھوڑتے تھے وہ اژدھا بن جاتا۔
برق دم ہونا	چالاک ہونا۔ تیز ہونا۔
جام بلور	قیمتی پتھر کا بنا ہوا پیالہ
ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا	سب سے ایک سا سلوک کرنا
مہجور	جدا کیا ہوا
رام ہونا	قابو میں ہونا
پھاگ	رنگ کھیلنا اور گانا جو پھاگ کہلاتا ہے۔ ہولی کا پھاگ مشہور ہے

۲۱۔ آنا بکاؤلی کا روح افزا پری کی خبر کو جمیلہ کیساتھ

الفاظ	معنی
عازم ہونا	ارادہ کرنا
سلاسل	زنجیر
زار نالی	رونا پیٹنا
رم	بھاگنا۔ جانا
دریا رویا	بہت رویا
دامن کشیدہ ہونا	دامن بچائے ہوئے
خط توامان	دو ورقہ خط
مشاطہ	دولہن کو بنانے اور سنوارنے والی عورت

۲۲۔ پیغام لیجانا حسن آرا کا بکاؤلی کی شادی کیواسطے

الفاظ	معنی
پینہ	روئی

الفاظ	معنی
حضرت سلیمان	ایک پیغمبر کا نام جن کے قبضہ میں دیو اور جن تھے۔
مسیحؑ	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب

۲۳۔ بیاہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک کیساتھ اور رہنا ارم میں

الفاظ	معنی
کلک	قلم
شنجرف	سرخ روشنائی
جیغہ	کلغی
شملہ	پگڑی جو نوشہ کے سر پر باندھی جاتی ہے۔
عارض	رخسار، چہرہ
تخت گل	شادی میں رسم کے واسطے پھولداری بناتے ہیں
چرخی	آتشبازی

الفاظ	معنی
شبدیز	سیاہ گھوڑا
مہمیز	سوار کے جوتے کا خار
پنجشاخے	پانچ بتی کی روشنی
رشک جم	جس کو دیکھکر جمشید بھی رشک کھائے
ہریالے	دعائیہ کلمہ
سنبل	ایک خوشبودار گھاس جس کو زلف محبوب سے تشبیہ دیتے ہیں۔
چنور	بالوں کا گچھا جس سے مکھیاں اڑاتے ہیں۔
چتر گل	پھولوں کی چھڑی
قلیاں	حقّہ
شہانے گانا	شادی کے گیت
نیگ	شادی کا انعام
شاہ خاور	سورج

۲۴۔ رخصت ہونا تاج الملوک کا بکاؤلی کو لیکر اور آنا گلشن نگارین میں

الفاظ	معنی
خانہ داماد	جو داماد سسرال میں بودو باش اختیار کرے۔

الفاظ	معنی
خانہ آباد ہونا	گھر بسنا۔ شادی ہو جانا۔
خویش	داماد
آئینہ رخ پر پانی ڈالنا	کسی کو رخصت کرتے وقت شگون کے لئے آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔
خیل و خدم	لشکر و سپاہ یا نوکر چاکر

الفاظ	معنی
پیا	محبوب
پکھاوج	ایک قسم کا باجہ
سپند	کالا دانہ جو شگون کے لئے جلاتے ہیں۔
راگ	مراد فساد

۲۵ طلب ہونا بکاؤلی کا راجہ اندر کی محفل میں

الفاظ	معنی
نے	نرکل
نواسنج	نغمہ گا رہا ہے
مصئون	محفوظ
خواب کرنا	سونا "خواب کردن" کا ترجمہ
کاکل معنبر	خوشبودار بال
دود اخگر	آگ کا دھواں

۲۶ نصف تنہیر کا ہو جانا بکاؤلی کا راجہ اندر کی بددعا سے

الفاظ	معنی
آئیں	دستور
جسم پایئں	نیچے کا دھڑ
انقلاب	تبدیلی
پیکر	صورت
شل	تھکا ہوا
جُل	دھوکا
عریانی	ننگا ہونا

الفاظ	معنی
ننگ	شرم
لجائیں	جھپیں
ستّار	خدا کا نام بمعنی چھپانے والا
خرسند	خوش
مہر	عنایت
استخارا	فال لینا
غرقہ	جھڑوکہ۔ کھڑکی
بیجا ہوا	خفا ہوا
زوُر	مکر۔ فریب
محبس	قید خانہ
یوسفؑ	ایک پیغمبر تھے جس سے شاہ مصر عزیز کی بیوی زلیخا محبّت کرتی تھی۔
کدخدا	شادی
سعدین	جب دو مبارک ستارے ایک برج میں یکجا ہو جائیں تو وہ سعدین کہلاتے ہیں۔
پاؤں کی مہندی نہ گھسنا	زیادہ تکلیف نہ ہونا

الفاظ	معنی
پسا ہوا	مصیبت زدہ
تلووں سے لگنا	کسی بات کی زیادہ فکر کرنا
کڑی اٹھانا	مصیبت جھیلنا
مامن	امن کی جگہ
پتھر تلے ہاتھ آنا	کسی مصیبت میں گرفتار ہونا
ہوا ہونا	بھاگ جانا
چھاتی پر پتھر رکھنا	صبر کرنا
دُرج	ڈبیا
مرّیخ	ایک ستارہ جو سختی کیلئے مشہور ہے
دل کے جلے پھپھولے پھوڑنا	غم کا اظہار غصّہ میں کرنا۔
خاک پتھر دیکھوگے	کچھ نہیں دیکھوگے
گل نکلنا	نئی بات ہونا

۲۷ پیدا ہونا بکاؤلی کا دہقان کے گھر میں

الفاظ	معنی
دہقاں	کاشتکار

الفاظ	معنی
گرد باد	بگولہ
واشد ہونا	کھلنا
ہتھیلی پر سرسوں جمانا	کوئی مشکل کام کرنا
آنکھوں میں سرسوں پھولنا	بہت خوش ہونا
فلفل	مرچ
زمین میں گڑنا	شرمندہ ہونا
پرکاہ	گھاس یعنی حقیر
خمسہ	وہ نظم جس میں پانچ مصرعہ ہوں چونکہ چار بیویاں اور ایک شہزادہ پانچ ہوتے ہیں اس لئے خمسہ کہا ہے
حواس خمسہ	پانچ انسانی حواس (سونگھنا، چھونا، دیکھنا، چکھنا، سننا)
مجموع	جمع ہونا
مسموع ہوئی	سنی گئی

۲۸۔ عاشق ہونا بہرام وزیرزادہ کا روح افزا پری پر

الفاظ	معنی
شگوفہ لائی	نئی بات پیدا ہوئی۔
دخاں	دھواں
دل پر ناگن لوٹنا	پیچ و تاب کھانا۔
سہا	ایک ستارہ جو چاند کے قریب رہتا ہے۔
پردہ رکھنا	بھید چھپانا
کنارگور ہونا	مرنے کے قریب ہونا
میری صورت آئینہ ہے	میرا حال ظاہر ہے۔
بادام دکھایا	آنکھ کو بادام سے تشبیہ دیتے ہیں یعنی آنکھ کا اشارہ کیا
بوتہ	گھڑیا جس میں سنار چاندی۔ سونا پگھلاتے ہیں۔
درسوم ساز	رسم و رواج کے مطابق سامان
خدایا	خدا [illegible]